حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

دعوت وفکر کے اہم پہلو

(مولانا کی تحریروں کی روشنی میں)

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ناشر

سیّد احمد شہید اکیڈمی

دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۷ء

نام کتاب	:	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
		دعوت وفکر کے اہم پہلو
مرتب	:	بلال عبدالحی حسنی ندوی
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
ت	:	۳۸۴
قیمت	:	۱۴۰ روپے
زنگ	:	طارق اشرف (اپیروچ کمپیوٹرز، امین آباد، لکھنؤ)

ملنے کے پتے

ابراہیم بک ڈپو	مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام	ندوۃ العلماء، لکھنؤ
مکتبہ اسلام	گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ

ناشر

سیّد احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

www.abulhasanalinadwi.org

فہرست

باب سوم

ادب اسلامی کی تشکیل
ایک تجدیدی کارنامہ (۱۵۸-۱۸۴)

باب چہارم

تعلیم، عملی جدوجہد، طریقہ کار
اور افکار وآثار (۱۸۵-۲۱۹)

باب پنجم

پیام انسانیت اور ملکی اصلاحات
کی فکروکوشش (۲۲۰-۲۵۹)

باب ششم

ملک وبیرون ملک درپیش دینی وملی مسائل اوران کے حل کی کوشش
(۲۶۰-۳۱۳)

باب ہفتم

اصلاحیات

(۳۱۴-۳۸۴)

مقدمہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مکمل سوانح حیات کئی لائق حضرات نے تصنیف کی ہے جس میں موجودہ کتاب کے مصنف جناب مولانا بلال عبدالحی حسنی بھی شامل ہیں، ان کتابوں میں حضرت مولانا کے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کے خاندان کا ذکر، جس کا تقریباً ہر شخص علوم دین سے شناسائی بلکہ مہارت رکھتا تھا اور خواتین بھی زبردست دینی اور ذوق رکھتی تھیں، ان کی پرورش، برادرِ بزرگ کی شفقتیں، ان کے اساتذہ کرام، ان کا تعلیمی سفر، غرض ان کی نجی زندگی کو آئینہ کی طرح سامنے کیا گیا ہے جو بقول کارلائل اس بات کا مصداق ہے کہ'' وہ ہے جس کو اس کے گھر والے سمجھیں''۔ حضرت مولانا روحانی کے بھی بادشاہ تھے، اپنی باطنی تربیت کے لیے انہوں نے کیا ریاضت کی؟ کن بزرگوں اور مرشدوں سے تعلق رکھا؟ اس کا بھی سیر حاصل بیان ملتا ہے، غرض کوئی گوشہ تشنہ نہیں، مگر اس کتاب میں ذہین اور لائق مصنف نے حضرت مولانا کے زندگی کے ان پہلوؤں کو لیا ہے جو ان کے دعوت وفکر کو اجاگر کرتی ہے، اس میں حضرت مولانا ایک مورّخ، ایک محقق، ایک مفکّر، ایک معلّم اور ایک مبلّغ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اِس میں اضطراب اور خلش کا بیان ہے، مومن کے لیے اقدار حیات کا تعین ہے، اس کا ذکر ہے، ہر جگہ یہ بات ہویدا ہے کہ اسلام کامل اور مکمّل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور ہمیں اسلام ہی سے جدید دلوں میں ایمان کی چنگاری روشن کرنی ہے کیونکہ اسلام کے ابدی حقائق ایسے ہیں کہ وہ ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ حضرت مولانا نے علم کی جستجو کی جو مومن کا گمشدہ مال تھا اور اسے بازیاب کیا، انسانیت کے پودے کے برگ و بار پھر سے تازہ ہو گئے۔ مولانا بلال ان باتوں کی وضاحت میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، بیان ایسا دلچسپ اور بھرپور کہ وہ لوگ جنہوں نے حضرت مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں، ان کے مشن سے واقف بلکہ شریک رہے ہیں، اور حضرت مولانا سے نیازمندی کا تعلق رکھتے تھے، وہ بھی اسے آموختہ نہیں سمجھیں گے اور ہر بات ان کو نئی لگے گی، یہ تحریر کی لذّت ہے۔

کتاب کی ابتداز مانۂ وسطیٰ میں مسلمانوں کی علم دوستی کے بیان سے ہے اور ئیوں کی علم دشمنی سے، اس زمانہ کی جو سلطنتیں تھیں اس کا اندروں چنگیز سے تاریک تر تھا، یونانیوں نے مذہب کو نظرانداز کر کے زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانے کو مقصد حیات سمجھا تھا، یہی حال رومیوں اور ایرانیوں کا تھا، مذہب جو نام نہاد تھا اسے بھی انتظام اور سیاست سے الگ کر دیا تھا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی ان کا عمل تھا، اور سب جنسی انارکی میں مبتلا تھے، کہیں بھی نظریات، خیالات اور تصوّرات کی کارفرمائی نہ تھی، پھر عرب میں آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور کلام پاک کا نزول ہوا جس کی پہلی آیت ''پڑھیئے'' کی ہدایت کر رہی ہے۔ سرکار دوعالم اس وقت کے معاشرہ میں کیا تبدیلی لائے تھے وہ حضرت جعفر طیارؓ کی نجاشی کے دربار میں تقریر سے واضح ہے۔

ئیوں نے اپنے کلیسا سے ''پڑھنے'' جیسے گناہ کی اجازت مانگی تاکہ اسلامی علوم کو حاصل کر کے ان کا توڑ کیا جائے، پوپ نے صرف اسلام دشمنی میں اس کی اجازت دی۔

وہ زمانہ جو یورپ کا تاریک دور کہلاتا ہے اس وقت مسلمانوں کے علم وحرکت کا کارواں رواں دواں تھا، یہاں دین ودنیا میں تفریق نہ تھی بلکہ دنیا مزرع آخرت تھی، وحشی قوم تاتاری جنھوں نے دنیا کو زیروزبر کر دیا تھا ایمان لے آئی تھی۔ وقت گزر گیا مسلمانوں کا انحطاط شروع ہوا اور یورپ آگے بڑھا، بیت المقدس ئیوں کے ہاتھ میں گیا، صلیبی جنگیں شروع ہوئیں، سلطان صلاح الدین ایوبی اپنی بے مثال فتوحات کے ساتھ سامنے آئے، ایک مرتبہ پھر بیت المقدس کی بازیافت ہوئی۔ تمام علم یورپ نے مسلمانوں سے سیکھے لیکن یونانیوں کو اپنا استاد کہا، پھر ایسا وقت آیا جب یورپ کی روشنئ علم وہنر نے مسلم ممالک، ان کے باشندوں، ان کے زعیموں کی آنکھوں کو چکاچوند کیا اور سب نام نہاد جدیدیت کی طرف آئے۔ مصر کے وزیر تعلیم طٰہٰ حسین ہوئے جو

مغرب سے بے حد مرعوب تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو سر سید نے مغربی نظام تعلیم کی طرف متوجہ کیا، اور اس کو عمل میں لائے۔ اکبرالہ آبادی کا طنز مذاق ہی رہ گیا، کسی نے کان نہیں دھرا۔ سیّد جمال الدین افغانی گو انگریزوں کے خلاف تھے مگر ان کا محاذ سیاست تھا۔ حضرت مولانا نے علامہ اقبال کو جدید مشرق کا سب سے بالغ نظر مفکر قرار دیا مگر ان کے اثرات بھی محدود رہے۔ مولانا مودودی کے لیے فرمایا کہ انہوں نے اپنے مضامین سے جدید ذہنوں میں علم دین کی وقعت پیدا کی۔

حضرت مولانا نے خالص دینی ماحول میں پرورش پائی لیکن باہر کی دنیا کو دیکھا اور برتا اور یہ محسوس کیا کہ مغربی تہذیب کے پس پشت جو فلسفہ ہے وہ الحاد کی طرف لے جارہا ہے، جہاد یہ ہے کہ جہالت کی بنیادی افکار سے علم وعقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، انھوں نے نہ خالص منفی رویہ اختیار کیا کہ جدید کو رد کیا جائے، نہ خالص مثبت کہ مکمل قبول کیا جائے بلکہ وہ معتدل موقف اختیار کیا جو حضرت مولانا کا خاص امتیاز ہے، مولانا کی معرکتہ الآرا تصنیف ''**ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین**'' میں مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب کا ذکر ہے، یورپ کی کوتاہ نظری پر تبصرہ کیا ہے اور مغربی مصنفین کی کتابوں سے ثابت کیا کہ یورپ کا موجودہ مذہب ئیت نہیں ہے، مادّہ پرستی ہے، قوت اور اخلاق میں عدم توازن ہے، غلو اور انتہا پسندی ہے، خالق کائنات سے بغاوت ہے۔ حضرت مولانا نے مستشرقین کے منفی اثرات کا ازالہ اپنی تحریروں سے کیا اور ئے اسلام کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

مغربی تہذیب اور اندازِ فکر کے خلاف حضرت مولانا نے مسلم ممالک میں بھی بیداری پیدا کی، ''قومیت عربیہ'' کے نعرہ کو کہا، یورپ اور امریکہ کے بے شمار ملکوں کا سفر کیا اور وہاں بسے مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، پاکستان، مصر، شام، شرقِ اُردن، ترکی تشریف لے گئے، یورپ کی خوبیوں اور خامیوں پر استادانہ شان سے انگلی رکھی، اس پورے باب کو مولانا بلال عبدالحی نے ایک چھوٹا سا مذہب اور اخلاق کا دائرۃ المعارف بنادیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب دعوتِ دین سے تعلق رکھتا ہے اور فاضل مصنف نے بڑی خوبی سے حضرت مولانا کے اندازِ دعوت کو بیان کیا ہے۔ مولانا کا فرمانا تھا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھلے دروازے سے داخل ہو، جو دروازے مقفّل ہوں ابتدا ہی سے اس کا قفل کھولنے کی کوشش نہ کریں ''اے اہل کتاب جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہو اس کی طرف آؤ''۔ حضرت مولانا نے سوال کیا ہے کہ دین کو ان ہاتھوں تک پہنچایا جائے جن کے پاس زمام اقتدار ہو یا دیندار لوگوں کو اقتدار تک پہنچایا جائے؟ پھر فرمایا کہ کرسی، اقتدار والوں کو مبارک۔ حضرت مولانا نے سلاطین اور امرا کی تربیت اور ارشاد کے چند واقعات لکھے ہیں، اور ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جو شریعت اور طریقت کے آسمان پر ستاروں کی طرح چمک رہے تھے جیسے حسن بصریؒ، شیخ عزالدینؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ وغیرہ۔

چودھویں صدی کے عالم اسلام کا ایک خاکہ کھینچا ہے، امیر سعود کو خط، امیر فیصل سے ملاقاتیں، ان کو مشورے اور نصیحتیں۔

مولانا بلال نے حضرت مولانا کا تقریباً پیغمبرانہ جملہ نقل کیا ہے کہ وہ اپنی دعوت کے لیے کسی اجرت کے طلب گار نہیں۔ امیر سعود کو خط سے اور امیر فیصل سے ملاقاتیں کر کے یہی نصیحت کی کہ ملک کی اصلاح کے لیے تعلیم پر پورا زور دیں، یہی ملک کی بقا اور اسلام کی بقا کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لبنان، مراکش، ترکی، پاکستان ہر جگہ نظام اسلامی کے نفاذ کی تلقین کی۔ امام خمینی سے ملاقات رہی اور عشق کے دردمند نے اپنا پیام انھیں بھی دیا۔ ایران میں حضرت مولانا نے سوال کیا کہ جس ملک میں صرف بطل اور ی لوگ پیدا ہوتے تھے اب وہاں قحط الرجال کیوں ہے؟ وزیر تعلیم سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت نے اقبال کا شعر پڑھا

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی

مصنف کتاب نے ان سب باتوں کو ریاضی کے اصولوں کی طرح نہیں بیان کیا ہے، ان کے لکھنے کا سلیقہ یہ ہے کہ لگتا ہے کہ حضرت مولانا پڑھنے والے سے خود یہ باتیں کر رہے ہیں، مختلف جگہوں کی تقریروں اور مختلف کتابوں اور خطوط کی تحریروں کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ ان میں وحدت آ گئی ہے۔

جوش اور جذبہ بین السطور میں ہے۔

تیسرے باب میں ایک تجدیدی کارنامہ کے عنوان سے زبان وادب کی اہمیت پر بات کی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے اور علوم کی طرح قرآن اور حدیث کے ساتھ ادب اور لغت پر بھی توجہ دی اور ادب میں مقصدیت پیدا کی، غیر مسلم ادباء کے کارناموں کو بھی تسلیم کیا مگر یہ دیکھا کہ اسلام پسندوں کی ادب پر پکڑ کم ہوتی گئی، اگر چہ ادب میں فحش گوئی اور بے حیائی کا شامل ہوتا گیا تاہم وہ لادینیت سے بچا رہا مگر ایک وقت آیا کہ بلاد عربیہ میں ایسے اہل قلم میدان میں آ گئے جن کے ذہنوں میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا، مولانا اس کے خلاف کھڑے ہو گئے اور ایسا ادبی لٹریچر تیار کر دیا جو زبان اور چاشنی میں کسی طرح مصری ادباء کے لٹریچر سے کم نہیں، پہلی صدی سے مختلف اسلامی مصنّفین میں ادب عالی کو ڈھونڈھ نکالا اور دکھایا کہ مسجد میں لگا ہوا گلاب اتنا ہی خوبصورت ہے جیسے کسی اور جگہ۔ رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل کی اور معاصر عرب ادباء سے خراج تحسین پایا۔

''مختارات'' مولانا کا بہترین مجموعہ ہے جو ملک کے اندر اور باہر بڑے عربی اداروں اور یونیورسٹیوں میں عربی ادب کے نصاب میں داخل کیا گیا۔
حضرت مولانا کی اردو تحریروں پر رشید صاحب نے جو بات کہی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

''کتاب پڑھتا گیا اور رائے قائم کرتا گیا کہ یہ تقریر سب سے اچھی ہوگی، دوسری کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ پچھلی سے اونچی۔ اس طرح خوب سے خوب تر کی طرف سفر کرتا گیا، آپ کے لیے ذہن میں جو تحسین کا دفتر کھلا وہ فی الحال قابو میں نہیں آتا کہ لکھ کر آپ تک پہنچا دوں، کتنے محدود ت میں آپ نے بصائر و معارف کا گراں بہا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔''

پھر نقوش اقبال حضرت مولانا کی بہترین کتاب ہے، بڑے بڑے تنقید نگاروں نے داد دی، اسے پڑھ کر صاحب ''گل رعنا'' کی یاد آتی ہے۔

اب مولانا بلال تعلیم کے میدان میں حضرت مولانا کی خدمات کا ذکر لاتے ہیں، انھوں نے ء کے ذہنی سطح کو سامنے رکھ تفہیم کے نئے طریقے دریافت کرنے کے لیے کہا، تعلیمی لیاقت کو ابھارنے کی کوشش پر توجہ دینے کی ہدایت دی، مقصدیت کو سامنے رکھنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے فرمایا کہ حدیث کے درس میں تقابلی فقہ پر زور نہیں صرف کرنا چاہیے اور اخلاقی اور معاشرتی معاملہ کو ابھارنا چاہیے، شاگردوں سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ حضرت مولانا نے بحیثیت استاد کے دس سال کام کیا، نصاب تعلیم میں تبدیلیاں لائے جس کی علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بڑی قدر کی، مدرسوں کو سرکاری امداد سے بچنے کی تلقین کی، یہ پرواز میں کوتاہی والی بات رہی۔

حضرت مولانا کے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال رہا کہ وہ ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی رہتے ہیں اور ان کے ا دکو حاصل کرنا ہے اور بھائی چارہ کی فضا بنانا ہے۔ انھوں نے انسانیت کا پیغام دیا اور ملکی اصلاحات کی فکر اور کوشش کی، انھوں نے مخلوط اجتماعات کو خطاب کیا اور اس کو باقاعدہ تحریکی شکل میں پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ موجودہ دور میں عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض، تعصّبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہی حقیقتیں رکھی جائیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے۔ فرمایا کہ پیام انسانیت کی تحریک ملک کے تمام دینی، تعلیمی، کوششوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھنی چاہیے، اچھا انسان انسان سے مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا نے اس نکتہ کی وضاحت کی کہ سارے انسان خدا کا کنبہ ہیں، یہ بات اس مذہب نے کہی ہے جس کو عقیدۂ توحید پر ذرا سی آنچ گوارا نہیں۔ انہوں نے ملک کے وزرائے اعظم کے نام مکاتیب لکھے۔ مسز گاندھی سے ایمرجنسی کے متعلق کہا کہ ''آزادی کی کسی تحریک، جدوجہد اور اس کے قائدین کی ناکامی کے لیے اس سے بُری بات نہیں ہو سکتی کہ لوگ اب برملا انگریزوں کو یاد کرنے لگے ہیں۔''
حضرت مولانا کی اس تحریک نے بڑے اچھے اثرات چھوڑے، ان کے جانشین اس مشن کو قائم رکھے ہیں۔
اس کتاب کا ہر باب دینداری اور دانشوری سے مملو ہے لیکن آخری بات کو اوّلیت حاصل ہے کیونکہ اس کا تعلق اصلاحیات سے ہے۔ حضرت مولانا

جس خاندان کے تھے وہاں توحید اور سنت اوّل و آخر، ظاہر و باطن رہا ہے، حضرت نے عقیدہ کی درستگی کو توحید سے وابستہ کیا اور اعتدال وغیرہ کو اسلام کی طاقت سے وابستہ نہیں کیا، اللہ پاک نے بالکل صاف بات کہہ دی کہ ''تم اپنے دین پر اور کافر اپنے دین پر۔''

مولانا نے انتہائی حقارت سے یہ بات کہی کہ شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے، اس کا اور اللہ کے دین کا کسی ایک جسم یا دل یا خطۂ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے۔ پھر فرمایا کہ شرک اور کفر اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے، اللہ نے اپنی نعمت ہم پر تمام کر دی اور تکمیل نعمت کے یہ خلاف کہ دین و شریعت کا ایک بڑا حصہ مشتبہ اور متعین چھوڑ دیا جائے، جو بات عہد رسالت میں دین نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتی۔ پھر فرمایا کہ رسالت کا عقیدہ، عقیدہ توحید کے بعد بنیادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حقیقت توحید تک رسائی، رسالت کے عقیدہ اور ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت مولانا نے آٹھ پر مغز خطبات جامعہ مدینہ منورہ میں دیے تھے جو کتابی شکل میں آ گئے، اور جن کا اُردو ترجمہ ہوا ہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں حضرت رائے پوری کی فرمائش پر پورے قادیانی لٹریچر کا جائزہ لے کر کتاب تیار کر دی تھی۔ عقیدۂ آخرت کے متعلق حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس علم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے، انسان کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، موت اور عالم برزخ ایک درمیانی منزل ہے، موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔

حضرت مولانا نے اصلاح معاشرہ کی طرف بڑی توجہ دی، ان کا خیال تھا کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے اس کی حیثیت بنیادی ہے، معاشرہ شاخ نشیمن ہے، شاخ نہیں تو نشیمن کا وجود بھی ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے جس طرح ہر طبقہ کو مخاطب کیا تھا اسی طرح حضرت مولانا نے ء سے بھی خطاب کیا ہے، طالبان علم نبوت کو ان کی ذمہ داریاں بتائیں اسلامی افواج کو خطاب کیا ہے، غیر اسلامی ماحول میں رہنے والے مسلمانوں کے امراض کی نشاندہی کی اور علاج کی دعوت دی۔

جناب مولانا بلال عبدالحی نے جو محنت اس کتاب کی تیاری میں کی ہے وہ بے حد قابل داد ہے، وہ کارنامے جو ایک بڑی مدت پر محیط تھے ان کے ذکر کو یکجا کرنا اور اس طرح کرنا کہ تسلسل میں فرق نہ آئے بڑے سلیقہ کا کام ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک بڑے لائق، بڑے ذہین اور بڑے انشاپرداز باپ کے بیٹے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ صندل کے عطر کی خوشبو صندل کی خوشبو سے بڑھ جاتی ہے، محمد میاں مرحوم کی روح اپنے بیٹے کے کارنامے پر بشاش ہوگی۔

ع داستانِ فصلِ گل خوش می سراید عندلیب

وصی احمد صدیقی

دار العلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

عرض مرتب

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالمرسلین محمدوعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو بجا طور پر بیسویں صدی کی اسلامی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے، اس کی بنیادی وجہ مولانا کی وہ جامع اور متوازن فکر ہے جس نے پورے عالم اسلام پر اثر ڈالا ہے۔

موجودہ دور میں اگر اسلامی مکاتبِ فکر کا مطالعہ کیا جائے تو بنیادی طور پر تین مکاتبِ فکر ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک مکتبِ فکر تو وہ ہے جس میں صرف اندرونی اصلاحات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور مسلمانوں کی پستی کا راز صرف اسی کو بتایا گیا ہے۔ دوسرے مکتبِ فکر میں مقابلہ کی پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ حق تو صرف غالب ہونے ہی کے لیے ہے، اس کو غالب کرنا ہے، ذرائع اور وسائل کچھ بھی اختیار کیے جائیں۔ اس میں اس کی ضرورت کم سے کم محسوس کی جاتی ہے کہ حق کے غالب نہ ہونے کے اسباب پر بھی غور کیا جائے، اور ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تیسرا مکتبِ فکر درمیانی ہے، جس میں اعتدال کی دعوت دی گئی ہے، ایک طرف اندرونی اصلاحات پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف غلبۂ حق کے لیے کوشاں رہنے کو ایک دینی ضرورت بتایا گیا ہے۔ یہ وہ معتدل اور متوازن مکتبِ فکر ہے جس کی دعوت حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پوری طاقت کے ساتھ پیش کی ہے، اور اس کی عملی تدابیر اختیار فرمائی ہیں۔

حضرت مولانا کے نزدیک سب سے پہلی ضرورت اندرونی اصلاحات کی ہے، پھر دین کو اقتدار تک پہونچانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے مولانا نے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے حکیمانہ راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے، مولانا کے نزدیک اس کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اس طبقہ کو متأثر کیا جائے جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار آنے والی ہو، یا وہ کسی بھی شعبۂ زندگی میں بنیادی کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس طبقہ نے اگر صحیح دینی تبلیغ قبول کرلی تو غلبۂ دین کی کوششیں آسانی سے کامیابی حاصل کرلیں گی، اور اگر ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی گئی تو اس میں صلاحیتوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت مولانا نے اس کے لیے جو عملی اقدامات کیے ہیں، ان کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا کی سب سے پہلی کوشش یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ (Intellectual Class) کو متأثر کیا جائے۔ مولانا نے اس طبقہ کی نفسیات کو سمجھا ہے، اور اس کو ایسے اسلوب میں خطاب کیا ہے جس سے وہ مانوس ہو، مولانا کی اکثر تصنیفات اور خطاب اس طبقہ کے لیے خاص طور پر اثر انگیز ہیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت مولانا کی معرکۃ الآراء تصنیف **"ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین"** (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) کو ملی، اس کتاب نے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پر زبردست اثر ڈالا ہے، طرز فکر کو بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اور متعدد ملکوں میں اس کتاب کے بہترین مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

مولانا نے اس سلسلہ میں متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ، ءاور ذمہ داروں کو خطاب کیا ہے اور خاص طور پر نظام تعلیم کو صحیح رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ رائج نظام تعلیم کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف توجہ دلائی ہے اور خاص طور پر اسلامی ملکوں میں نئے نظام تعلیم کو نافذ کرنے کی طاقتور دعوت پیش کی ہے۔

متعدد اسلامی ملکوں کے وزرائے تعلیم کے سامنے خطاب کا بھی مولانا کو موقع ملا، مولانا نے اس موقع پر دل نکال رکھدیا اور زبانِ دل سے گفتگو کی۔ یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر بھی ذہن سازی کی کوشش کی۔ مولانا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اس کو خاص اہمیت دی ہے اور ملک کی ترقی کے لیے اور اس کو صحیح رخ دینے کے لیے سب سے زیادہ اہم نظام تعلیم ہی کو قرار دیا ہے۔

مولانا کا دوسرا کام یہ ہے کہ انھوں نے حکمراں طبقہ کو متأثر کیا اور اس کی ذہن سازی کی کوششیں کی ہیں، ملاقاتوں کے ذریعہ سے بھی، خطاب کے

ذریعہ سے بھی اور خاص طور پر مراسلت کے ذریعہ سے، مختلف ملکوں میں اس کے بہتر نتائج مرتب ہوئے۔

حضرت مولانا نے تیسرا اہم کام یہ کیا کہ ادب کو اصلاح وتجدید کا ذریعہ بنایا، اس زمانے میں ادب پر دین سے اور ملحدانہ افکار رکھنے والے ادباء و مفکرین کی چھاپ تھی، جس کے نتیجہ میں نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ تیزی سے الحاد کی طرف جارہا تھا اور ادب کے راستہ سے دین بیزاری پیدا ہورہی تھی۔ حضرت مولانا نے صاف صاف اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اگر ادب کی لگام اسی طرح ملحدوں کے ہاتھ میں رہی تو نوجوانوں کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ مولانا نے عربی زبان وادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، عربی ادب کی پوری تاریخ ان کے سامنے تھی، مولانا نے خود کمان سنبھالی اور عربی ادب کی تحریک کو ایک نیا رخ دیا۔ مولانا نے ایک طرف اس کی دعوت دی کہ ادب کی سرحدوں کو وسیع کیا جائے، دوسری طرف خود مولانا نے عربی زبان وادب کے بہترین نمونے پیش کیے، اس طرح ادب پر ترقی پسند ادباء کی اجارہ داری ختم ہوئی اور عربی ادب کے افق پر جابجا اسلام پسند ادباء نظر آنے لگے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ جو اب تک تخریبی ادب سے مانوس تھا اس کے سامنے تعمیری ادب کے بہترین نمونے آئے، وہ اس سے متأثر ہوا، اور اس کے ذہن وفکر میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

ہر قوم کے عروج وزوال کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے، قوموں کے مستقبل پر اس کا اثر پڑتا ہے، کوئی ترقی پذیر قوم اپنی تاریخ سے صرفِ نظر نہیں کرسکتی، اس میں اس کے لیے سیکڑوں ایسے مقامات آئے ہیں جن سے اس کو سبق حاصل ہوتا ہے اور آگے کے سفر میں سہولت ملتی ہے۔ مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کو اسی نظر سے کھنگالا ہے، اس کے نشیب وفراز کو پرکھا ہے، اور ملت کو اس میں سے قیمتی موتی نکال کردیتے ہیں، کاروان ملت کے مسافروں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

ملکی سطح پر حضرت مولانا کے اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے ملک میں مسلمانوں کے تحفظ وبقاء کے لیے زمین ہموار کی ہے، ''پیام انسانیت'' کی تحریک چلا کر مولانا نے ملک کے لیے مسلمانوں کی افادیت ثابت کی ہے۔ اور کسی بھی قوم کے بقاء اور ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی نافعیت اور افادیت ثابت کرے، اس تحریک سے یہ اہم ترین ضرورت پوری ہوئی ہے، اور دوسرے دعوتی کاموں اور اصلاحی وفکری تحریکات کے لیے بھی زمین ہموار ہوئی ہے۔

پیش نظر کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حضرت مولانا کی تصنیفات اور مکتوبات کی روشنی میں مولانا کی دعوت اور فکر کے ان اہم گوشوں کو نمایاں کیا جائے تاکہ دعوتی اور فکری کام کرنے والوں کو اس سے رہنمائی مل سکے۔

حضرت مولانا کی وفات کے بعد سے اردو اور عربی میں دسیوں کتابیں مولانا کی سیرت وحیات اور نقوش وتأثرات پر لکھی گئیں، جن میں سب سے ممتاز کتاب حضرت مولانا کے جانشیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ کی ہے جو ''ایک عہد ساز شخصیت کے نام سے شایع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سیرت وحیات کے ساتھ حضرت مولانا کی فکر کا جوہر آگیا ہے۔ راقم سطور نے حضرت مولانا کی وفات کے بعد ہی ''سوانح مفکر اسلام'' کے نام سے کتاب ترتیب دی تھی لیکن اس کی ضرورت باقی تھی کہ مولانا کی دعوت وفکر پر خود مولانا کی تحریروں اور تقریروں کو سامنے رکھ کر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ پیش نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے مرتب کی گئی ہے۔

عم مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور عم مخدوم مولانا سید واضح رشید ندوی مدظلہم نے کتاب ملاحظہ فرمائی، اصلاحات بھی فرمائیں اور بعض اہم گوشوں کی طرف رہنمائی فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری کتاب ان ہی حضرات کی توجہ اور رہنمائی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت عطا فرمائے، اور ان کے فیوض عام فرمائے۔

راقم خاص طور پر محترم المقام جناب پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب کا ممنون ہے کہ انھوں نے فاضلانہ مقدمہ لکھ کر کتاب کی قیمت بڑھائی، راقم کے لیے سعادت کی بات ہے کہ مشہور عالم و مولانا قاضی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے بھی کتاب پر ت تحسین تحریر فرمائے، عزیز گرامی

قدر مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی سلّمہٗ کی کوششوں سے یہ کام ممکن ہوسکا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اخیر میں ان تمام معاونین کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے کتاب کی تبییض یا پروف کی تصحیح اور اشاعت میں حصہ لیا اور محنت کی، ان میں عزیزی مولوی محمد نفیس خان ندوی سلّمہٗ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہتر جزاء عطا کرے اور کتاب کو مقبول فرمائے۔ **وماذلک علی اللہ بعزیز.**

بلال عبدالحی حسنی ندوی

۱۶؍رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ دارعرفات

پیش لفظ

علامہ محمد تقی عثمانی
(دارالعلوم کراچی، پاکستان)

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ.

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ ہمارے زمانے کی ان گنی چنی شخصیات میں سے تھے جنہوں نے خدمت دین کے بہت سے شعبوں میں اپنے مآ ثر طیبہ اور جگمگاتی ہوئی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ کے کارناموں اور خدمات پر مختلف پہلوؤں سے کام کی ضرورت ہے، جو بحمد اللہ ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

اسی سلسلہ میں حضرتؒ ہی کے خانوادہ کے ایک چشم و چراغ جناب مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی زید مجدہم نے یہ کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں حضرتؒ کی دعوت وفکر کے اہم پہلو اُنہی کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں، میں اپنی نااہلی اور مصروفیات کی بنا پر کتاب کا پورا مطالعہ کرنے سے تو محروم رہا، لیکن جستہ جستہ نظر ڈال سکا، اور جہاں نظر ڈالی مفید مضامین نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرما کر اسے قارئین کے لیے نافع بنائیں۔

آمین ثم آمین

بندہ
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

باب اول

مغربی تہذیب کا طوفان اور اس کا مقابلہ

اسلام کے عروج وزوال کا مطالعہ کرنے والا خوب واقف ہے کہ چھٹی صدی ہجری تک مسلمان ہی، تمدنی اور فوجی لحاظ سے دنیا کی دوسری قوموں سے بہتر تھے اور کوئی قوم ان کو شکست دینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ اس وقت تک دین دنیا کی کوئی تفریق نہ تھی، دنیا برتنے کے لیے جن علوم کی ضرورت پڑسکتی تھی مسلمانوں نے ان کو ترقی دی، اور بہت سے نئے علوم بھی وجود میں آئے، لیکن ان کو دین کی سرپرستی حاصل تھی، ان کی باگ ڈور اہل دین کے ہاتھوں میں تھی، اسلام کی بنیاد ہی علم پر پڑی تھی، سب سے پہلی وحی میں قلم کا تذکرہ کیا گیا تھا، اسلام نے ہمیشہ علم دوستی کا ثبوت دیا اور زمانہ کو علم سے بھر دیا، صدیوں تک دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرسکی۔

اسلام کے بعد ئیت سب سے بڑا مذہب تھا لیکن اس کی بنیاد ہی علم دشمنی پر تھی، علم حاصل کرنا، لکھنا پڑھنا ان کے یہاں بہت بڑا گناہ تھا، وہ صدیوں مسلمانوں سے نبرد آزما رہے، تاہم میدان مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہا۔

آہستہ آہستہ صورت حال تبدیل ہونا شروع ہوئی، مسلمانوں نے علم سے بے توجہی برتنی شروع کی اور دوسری طرف ئی مفکرین نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ بالاتری کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتے، کلیسا نے ابتدا میں اس کی پرزور مخالفت کی اور مذہب وتمدن کی کشمکش جاری رہی بالآخر کلیسا نے شکست کھائی اور اس کو زندگی کے میدان سے بالکل الگ کردیا گیا۔

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا　　چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

شاہ فرانس لوئس نہم (۱۲۷۰ء) جس کو مصر میں گرفتاری کے بعد تیونس پر حملہ میں ناکامی ہوئی اس نے مرتے وقت وصیت نامہ میں لکھا کہ ہم عرصہ دراز سے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، صلیبی جنگوں کا تسلسل زمانہ سے جاری ہے لیکن ہم غالب نہیں آسکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حملہ کے وقت مسلمانوں میں ایسا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے جس کا مقابلہ مشکل ہے۔ اس جذبہ کو روکنے کے لیے اب دوسرے وسائل اختیار کرنے چاہیے۔ اور اس کی صرف یہی تدبیر ہے کہ ہم ان کے ذہنوں کو متاثر کریں۔ (۱)

اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ریمن لل (Raman Lull) (۱۳۱۰-۱۲۳۲ء) اور روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۹۴-۱۲۱۴ء) نے پوپ سے مل کر ان سے اسلامی علوم حاصل کرنے کی اجازت چاہی، پوپ کو اس میں تردد تھا۔ مگر جب اس کو یہ بتایا گیا کہ اس کا مقصد ئیت کی خدمت ہے اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہنوں کو متأثر کرنے میں مدد ملے گی اور ان پر حاصل کیا جاسکے گا تو پوپ نے بڑی ردوقدح کے بعد اس کی اجازت دے دی۔ اس سے قبل خفیہ طور پر یورپ کے لوگ اندلس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، بعض اسلامی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے تھے۔ پوپ کی اجازت کے بعد یہ کام وسعت کے ساتھ شروع ہوا۔ (۲)

یورپ میں تعلیمی ادارے تیرہویں صدی ی سے قائم ہونا شروع ہوئے۔ پندرہویں صدی میں پریس کی ایجاد اور قسطنطنیہ اور اندلس کے سرمایہ کی منتقلی کے بعد انقلاب آیا اور یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا جس کے نتائج واضح شکل میں سولہویں اور سترھویں صدی میں ظاہر ہونے لگے، جس کے نتیجہ میں یورپ کو عالم اسلام پر برتری حاصل ہوئی۔

دنیا کے عروج وزوال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن قوموں نے ترقی کی ان کی فکر وتہذیب کی چھاپ دوسری مغلوب قوموں پر پڑی وہ قومیں اس سے

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، جب تک مسلمان ترقی یافتہ قوم سمجھے جاتے تھے اس وقت تک دنیا پر اسلامی ثقافت کا اثر قائم رہا اور جب یہ گیند ئیوں کے پالے میں چلی گئی اور اخیر دور میں یہودی ان کے حلیف بن گئے تو دنیا پر آج اسی تہذیب کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

تہذیب کیا ہے؟

''تہذیب'' اور ''ثقافت'' یہ دونوں الفاظ عام طور پر ایک ساتھ بولے جاتے ہیں اور اکثر ان کو ہم معنیٰ ہی سمجھا جاتا ہے لیکن محققین کی رائے میں ثقافت نظریات، خیالات وتصورات کا نام ہے جب کہ ان نظریات کے عملی تجربات اور ترقیات کو تہذیب کہتے ہیں۔ ثقافت کی تشکیل معاصر فلسفوں، نظریات اور ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں سے ہوتی ہے۔ اسی کے تانے بانے سے ہو کر انسان جن مراحل سے گزرتا ہے اور جو تجربات اس کے سامنے آتے ہیں اس کو تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ عام طور سے اس کے چار عناصر ترکیبی بیان کیے جاتے ہیں: اقتصادی ذرائع، سیاسی نظم، اخلاقی اصول اور علوم وفنون کا استحکام۔ تہذیب کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے زمین پر انسان کو قرار وسکون حاصل ہوا، تہذیب کی کڑیاں مسلسل ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور ہر زمانے نے آئندہ آنے والوں کے لیے تہذیب کی تاریخ میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

یونانی ورومی تہذیب

تہذیب وعلم کی تاریخ میں یونان کا ذکر جلی حرفوں میں ملتا ہے، علم وفلسفہ، ادب وشاعری اور تہذیب وتمدن میں اس کو دنیا کی امامت کا درجہ ملا تھا، ساری دنیا پر اس کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس یونانی تہذیب کی بنیاد ہی مادّیت پر تھی۔ یورپ کے مورخین نے اس کو تسلیم کیا ہے اور ان کی دینی کمزوری، مذہبی اعمال ورسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کی چار بنیادی خصوصیات بیان فرمائی ہیں :

۱- غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ (یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی ذات کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کر سکے)

۲- خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳- دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید۔

۴- حب وطن میں افراط وغلو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

''اگر ہم ان کو ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا ''مادیت'' کا لفظ کافی ہے۔''(۱)

یونانیوں کے اس طرز فکر نے ان کی معاشرت واخلاق کو بگاڑ کر رکھ دیا، خواہشات نفس کی پیروی، زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی اور بوالہوسی کو روشن خیالی اور آزادی کی علامت سمجھا جانے لگا۔

یونانیوں کے بعد رومیوں نے ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا، ان کی تہذیب بھی یونانی تہذیب کا نیا ایڈیشن کہی جا سکتی ہے، چونکہ وہ عسکری قوت، وسعت مملکت میں یونانیوں سے آگے بڑھ گئے تھے اس لیے ان کے یہاں طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہنچ گیا تھا۔

انہوں نے شروع ہی سے طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں کو سیاست اور حکومت سے دور رکھا جائے۔ چند ظاہری رسمیں پوری کر کے وہ آزاد تھے۔

''سسرو (Cicero) بیان کرتا ہے کہ تھیٹر میں جب اس قسم کے اشعار پڑھے جاتے تھے تو لوگ انہیں نہایت ذوق وشوق سے سنتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں''(۲)

حضرت مولانا اس رومی تہذیب کا انجام کار بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''جمہوری دور کے آخر میں روم میں اخلاقی انحطاط، حیوانی، ہوس رانی اور تعیش کا ایسا سیلاب آیا کہ رومی اس میں بالکل ڈوب گئے اور وہ اخلاقی

نظام وضوابط جو رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے، اجتماع اور معاشرت کی عمارت میں ایسا زلزلہ آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آرہے۔'' (۱)

جہاں تک ایرانی تہذیب کا تعلق ہے تو شاید اس کو تہذیب کہنا بھی بدتہذیبی شمار کی جائے، اگر چہ ایران متمدن دنیا کی تولیت وانتظام میں روم کا شریک تھا لیکن اس کے پاس کوئی دین یا اخلاقی نظام نہیں تھا، عورت کا درجہ جانور سے بدتر تھا، تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال کر دیا گیا تھا اور پانی آگ اور چارہ کی طرح اس کو سب کی مشترک ملک قرار دے دیا گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا، نہ باپ اپنے لڑکے کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو، کسی کو اپنی ملکیت میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ کھلے ہوئے آتش پرست اور مشرک تھے۔ شاہ پرستی کا یہ حال تھا کہ حکومت شاہی خاندان کی جاگیر سمجھی جاتی تھی، کوئی سن رسیدہ شخص وارث نہ ہوتا تو بچے کو ہی اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیتے اور طرفہ یہ کہ ان تمام بداخلاقیوں اور انسانیت سوز حرکتوں کے باوجود اپنی قوم کو دنیا کی افضل ترین قوم گردانتے تھے۔

حاصل یہ کہ تہذیب انسانیت کی گاڑی ایک ایسے ڈھلوان پر پڑ گئی تھی کہ اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور قریب تھا کہ وہ گہری کھائی میں گر کر پوری طرح تباہ وبرباد ہو جائے کہ اچانک ''ختم نبوت'' کا آفتاب طلوع ہوا۔

اس وقت کے تمدن سے بہت دور عرب کے تپتے صحرا میں باد بہاری کا ایسا دلنواز جھونکا چلا کہ جس نے ساری دنیا کی کھیتی لہلہادی، تہذیب انسانیت کو نئی بنیادوں پر استوار کیا گیا، تہذیب کی شمعیں روشن کی گئیں اور دیکھتے دیکھتے دنیا میں اس نئی تہذیب کا غلغلہ بلند ہو گیا۔

اسلامی تہذیب

گزشتہ اوراق میں یہ بات گزر چکی ہے کہ تہذیب کی تشکیل چار چیزوں سے ہوتی ہے: اقتصادی ذرائع، سیاسی نظم، اخلاقی قواعد وضوابط اور علوم وفنون کا استحکام۔ بعثت نبوی (علی صاحبها الصلوٰۃ و السلام) کے بعد سب سے پہلے بگڑے ہوئے اخلاقی نظام کو سنوارا گیا، اس کے اصول وضوابط متعین کیے، کمزوروں کو ان کا حق دیا گیا، صنف نازک کو اس کا درجہ ملا اور زندگی کی چول جو اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اس کو بٹھایا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے عم زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی (شاہ حبشہ) کے دربار میں جو تقریر کی وہ انہیں اخلاقی بلندیوں کا مظہر تھی جو نبی کریم ﷺ نے انسانیت کو عطا فرمائیں تھیں۔

علوم وفنون کے استحکام وترقی کی شاہ تو قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جس سے وحی کا آغاز ہوتا ہے، سب سے پہلے اس میں پڑھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے تعلیم وتعلم کی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ بدر کے قیدیوں کا یہی فدیہ متعین کیا گیا تھا کہ ان میں جو پڑھے لکھے ہوں وہ بچوں کو تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے بعض صحابہ کو عبرانی اور دوسری زبانیں سیکھنے کا بھی حکم فرمایا تھا۔ تمام مذاہب میں اسلام نے علم کی اہمیت جس طرح اجاگر کی ہے اور اس کو طاقت بہم پہنچائی ہے دنیا کا کوئی مذہب اس کا عشر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حضور ﷺ کے دور ہی سے علم کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ ﷺ نے علم کے لیے جو بنیادیں فراہم کیں، بعد میں اس پر بڑے بڑے محلات اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح دنیا کو علم سے بھر دیا اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا مکتب فکر میں نہیں ملتی۔ اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ اس نے صحیح بنیادوں پر علم کو آگے بڑھایا اور اس کے ساتھ عظمت رب شامل کی۔ پہلی ہی وحی میں اقرأ (پڑھنے) کے ساتھ باسم ربک (اپنے رب کے نام سے) کی شرط لگادی گئی تاکہ انسان بے مہار نہ ہو اور علم کا استعمال بے جا نہ ہو سکے۔

جہاں تک سیاسی نظم وضبط کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد جس اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی وہ ایسے مضبوط اصولوں اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوئی تھی کہ اس نے دنیا کی بڑی بڑی شہنشاہیوں کو جو اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں اور ساری انسانی قدریں کھو چکی تھیں صرف ہلا

کر ہی نہیں بلکہ مٹا کر رکھ دیا اور پھر دوسو سال کے اندر اندر اس سلطنت میں ایسی وسعت ہوئی کہ خلیفہ وقت ہارون رشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر کہا کہ ''أمطری حیث شئت فسیأتینی خراجک'' جہاں چاہے جا کر برس تیرا محصول یہیں میرے پاس آئے گا۔

اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ اسلام کا اقتصادی نظام بھی مضبوط ہوتا چلا گیا، جس کی اصل بنیاد اسلام کا وہ نظام زکوٰۃ وصدقات ہے جو اقتصادی نظام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اتنی وسیع سلطنت میں جو تقریباً آدھی دنیا پر مشتمل تھی مفلوک الحال لوگ شاید ڈھونڈ ھنے سے بھی نہ ملتے۔ امن وامان کا یہ حال ہوا کہ آپ ﷺ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی ایک بڑھیا ایک شہر سے دوسرے شہر تک آرام سے جاسکتی تھی، اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

شروع ہی سے علوم دینیہ کے ساتھ دوسرے علوم جو انسانی زندگی کے لیے مفید اور ضروری تھے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز رہے اور تدریجی طور پر ان علوم نے ارتقاء کے مراحل طے کیے۔ یونانی علوم کا بڑا حصہ عربی میں منتقل کیا گیا اور اس کے مضر اجزاء کو چھوڑ کر اس کے بقیہ حصوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اس سلسلہ میں مسلمان ء نے نہ کسی قسم کا تعصب برتا اور نہ ہی وہ غفلت کا شکار ہوئے، بلکہ پورے حزم واحتیاط کے ساتھ انہوں نے ان علوم سے فائدہ اٹھایا۔ یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، ہسپتال بنائے گئے اور نئے نئے تجربات کیے گئے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جدید سائنس کی بنیاد بھی مسلمانوں نے ہی رکھی اور بہت سے ایسے اصول بنائے جن کی بنیادوں پر سائنسی ترقیات ممکن ہوسکیں۔

لیکن یہ سب اسی وقت تک ہوسکا جب تک مسلمانوں نے اسلام کے اصولوں کو سامنے رکھا، دین اور دنیا میں تفریق نہیں کی اور علوم وفنون کی ترقی دین کے سایہ میں ہوتی رہی، پھر وہ وقت بھی آیا کہ دنیاوی علوم مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ دینی اصولوں میں بھی غفلت برتی جانے لگی اور آہستہ آہستہ دنیا پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی پھر تاریخ نے پانسہ پلٹا اور اسلامی طاقت منتشر ہوکر رہ گئی۔

یورپ کا تاریک دور

پانچویں صدی ی سے لے کر دسویں صدی ی تک کا زمانہ یورپ کا تاریک ترین دور (Dark Ages) کہلاتا ہے۔ آپس کی خانہ جنگیاں، بربریت، مظالم اور جہالت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، دوا علاج کا استعمال بھی ان کے یہاں جرم تھا اس لیے کہ ان کے دینی پیشوایان کو ڈر تھا کہ کہیں ان کی اجارہ داری پر ضرب نہ آجائے۔

رابرٹ بریفالٹ (Roberot Briffault) لکھتا ہے:

> ''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی ....اٹلی اور فرانس جیسے شہروں میں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔''(۱)

چھٹی صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک کا یہی وہ دور تھا جس میں اسلامی تہذیب وتمدن اپنے عروج پر تھا اور دنیا کے کونے کونے میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی، قدرتی طور پر یورپ میں بھی اس کے اثرات پڑنے لگے جس کی آخری مثال یہ ہے کہ وہاں باقاعدہ تحریک چل پڑی کہ تصویر گری اور بت تراشی ایک خلاف مذہب فعل ہے اور ان میں کوئی تقدیس نہیں۔ شاہان رومانے اس تحریک کی پشت پناہی کی، مسیحی اور بت پرست یورپ اور رومی ویونانی تمدن میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار وجہاد یقیناً اسلام کی بت شکنی اور اعلان توحید کی صدائے بازگشت تھی۔

گیارہویں صدی ی سے مسیحی یورپ کی مسلمانوں سے کشمکش

مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور ادھر یورپ اپنی طویل نیند سے بیدار ہوا، اس نے علم کے میدان میں ترقی شروع کی، اور آہستہ آہستہ پانچ صدیاں بھی نہیں گذری تھیں کہ دنیا کے افق پر اس کا ستارہ چمکنے لگا۔

صلیبی جنگوں کا جب آغاز ہوا تھا تو مسیحی یورپ کو شکستوں کا منھ دیکھنا پڑا تھا(۲) لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی قوت مجتمع کر کے شام وفلسطین کا رخ کیا اور بڑی فتوحات حاصل کیں یہاں تک کہ بیت المقدس ان کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ مسلمانوں کی بہت بڑی شکست تھی جس سے ان کو دوچار ہونا پڑا،

صلیبیوں کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ وہ حجاز مقدس پر حملہ کرنے کے خواب دیکھنے لگے، مگر اسی عرصہ میں عالم اسلام کے افق سے ایک نیا ستارہ طلوع ہوا عماد الدین زنگیؒ اوران کے فرزند نورالدین زنگیؒ کی قیادت میں مسلمانوں نے پے در پے صلیبیوں کو شکست دی، بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے دوبارہ بیت المقدس کو آزاد کرایا اور فلسطین کا پورا علاقہ صلیبیوں سے پاک ہوگیا۔

اس نئی طاقت کے مقابلہ کے لیے سارا یورپ متحد ہوگیا اوراس نے ایک ہوکر شام پر حملہ کیا، سلطان کی فوجیں مردانہ وار مقابلہ کرتی رہیں، آخر پانچ برس کی خونریز جنگوں کے بعد دونوں فریق صلح پر رضامند ہوگئے لیکن پلڑا مسلمانوں ہی کا بھاری رہا، پورا فلسطین ان کے قبضہ میں رہا، صرف ایک چھوٹی سی ریاست ئیوں کے پاس تھی۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی وفات کے بعد پھر مسلمانوں کی طاقت منتشر ہونا شروع ہوئی، تو میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں، تاتاریوں نے بڑے بڑے متمدن اسلامی شہروں کو تاراج کیا تاہم مصر میں ان کو الملک المظفر سیف الدین قطز کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔ ان کے بعد الملک الظاہر بیبرس نے ان کو آخری شکست دی اور شام سے بے دخل کردیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ تاتاری قوم مسلمان ہوگئی۔ ان جدید الاسلام تاتاریوں میں عالم اسلام کی قیادت کی صلاحیت نہیں تھی مگر اللہ کو ابھی مسلمانوں سے کام لینا منظور تھا، آٹھویں صدی ہجری میں عثمانی ترک سامنے آئے اور پندرھویں صدی ی میں محمد الفاتح نے قسطنطنیہ فتح کرکے یورپ پر مسلمانوں کی دھاک بٹھادی، اس طرح تین سو سال تک عثمانیوں نے پورے کرّ وفر کے ساتھ عالم اسلام پر حکومت کی۔

دولت عثمانیہ کے معاصر مشرق میں دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں، ایک ہندوستان کی مغلیہ سلطنت، دوسرے ایران کی صفوی سلطنت۔ لیکن دونوں اپنے مسائل ومعاملات میں ایسی الجھی رہیں کہ باہر کی دنیا سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔

یورپ کا ارتقاء

سولھویں صدی اور سترھویں صدی سے ترک بھی جمود کا شکار ہونے لگے اوران میں تنزل اور انحطاط شروع ہوگیا۔ یورپ کا یہی زمانہ ارتقاء کا ہے، وہ پورے جوش کے ساتھ آگے بڑھنے میں لگ گیا، سائنسی میدان میں انہوں نے طرح طرح کے انکشافات شروع کیے اوراسی زمانہ میں ان کے یہاں بڑے بڑے محقق، موجد، اور مجتہد فن پیدا ہوئے، فنون حربیہ میں بھی وہ بہت آگے بڑھ گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۷۴ء میں اس کی فوجوں نے عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی۔ اس سے سبق لیتے ہوئے عثمانی حکومت نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن وقت بہت گذر چکا تھا اور مریض جاں بلب ہورہا تھا، طاقت کی چند گولیاں دے کر اس کو کچھ دیر کے لیے سنبھالا تو دیا جاسکتا تھا مگر اس لب گور مریض کی جان بچانا بہت مشکل کام تھا۔ دوسری طرف یورپ طاقت ونشاط سے بھرپور عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، دیکھتے دیکھتے وہ عالمگیر طاقت واقتدار اور ذہنی اور تہذیبی قیادت کا مالک بن گیا اور دنیا کا کوئی ملک اس کے اثر و نفوذ سے باہر نہ رہ سکا۔

اسلام سے تضاد واختلاف

یورپ نے اپنے سفر کا آغاز اگرچہ مسلمانوں کی انگلی پکڑ کر کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہی ان کے معلّم اول ہیں لیکن اسلام دشمنی کے نتیجہ میں یورپ نے یونان کو اپنا اصل معلم قرار دیا اور یونانی تہذیب وتمدن کو حاکم وکاست اپنے اندر سمولیا جس کی وجہ سے مادیت اس کی سرشت میں داخل ہوگئی۔

یورپ کی مادہ پرستانہ ذہنیت کا پوری دنیا پر اثر پڑا، وہ اپنی طبعی تحقیقات اور صنعتی ا فات واختراعات میں انتہائی بلندیوں کو چھو رہا تھا تو دوسری طرف دین واخلاق میں آخری درجہ کے تنزل وانحطاط کا شکار ہورہا تھا۔ ایک طرف وہ صنعتی کمالات وعجائبات، طبعی قوتوں کی تسخیر میں انسان سے پرے کوئی مخلوق معلوم ہوتی ہے، تو دوسری طرف اخلاق واعمال، حرص وطمع، سنگ دلی وبے دردی میں اس کی سطح جانوروں سے بھی کم تر نظر آتی ہے۔ دولت وقوت کے

حصول کے لیے زندگی کے تمام اصولوں کو پیروں تلے روندڈالنا ان کے لیے آسان ہوگیا، تمدن واخلاق کے صحیح اصول ومبادی کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، ملحدانہ فلسفہ نے ان کے ذوق کو فاسد کردیا اور طبیعتوں میں انحراف پیدا کردیا۔

جاہلیت مسلّح ہوکر نئے قالب میں سامنے آرہی تھی جس کے جلو میں دنیا کی آرائش وزیبائش کا پورا سامان موجود تھا۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا کہ اس کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان بنے، اس لیے وہی اس کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکتے تھے، جاہلیت کا تضاد واختلاف اسلامی نظام زندگی ہی سے تھا، بقیہ مذاہب و افکار سے اس تہذیب جدید کا کوئی بڑا ٹکراؤ نہیں تھا۔

اسلام سے مغربی تہذیب کی کشمکش کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تنہا اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مخصوص عقائد واقدار رکھتا ہے اور اس سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ جب کہ دوسرے مذاہب میں کوئی ایسا ٹھوس نظام نہیں ہے، وہ ہر فلسفہ کو قبول کرنے کو تیار ہیں۔ بقول حضرت مولاناؒ کے :

''اصل مسئلہ ہمارے مسلم معاشرہ کو پیش آیا، وہاں توحید کا ایک مفہوم ہے، اس کے حدود معین ہیں کہ یہاں تک ایمان ہے، اس کے بعد کفر کی سرحد شروع ہوجاتی ہے''۔(۱) ''اس کو اصرار ہے کہ نور وایمان کے حدود متعین ہیں، اس کو اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں، جب مغربی تہذیب اپنے پورے تصورات کے ساتھ، پورے اقدار حیات کے ساتھ، پورے مقاصد کے ساتھ آئی تو اس کا اس سے ٹکراؤ لازمی تھا، ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا۔''(۲)

چونکہ یہ تہذیب اپنے جلو میں ترقیات وا فات کا ایک بحر بیکراں رکھتی تھی، اس لیے اس تہذیب کے اثرات بالعموم عالم اسلامی پر اور بالخصوص عالم عربی پر بڑے گہرے پڑ رہے تھے، نوجوان کے سروں میں اسی کا سودا سما تا جارہا تھا، اور یہ تہذیب اپنی تمام فحاشیوں، بداخلاقیوں، سرمستیوں اور انسان سوز حرکتوں کے ساتھ ان ملکوں میں جگہ بناتی جارہی تھی، حکومتیں اس کے سامنے جھکنے لگی تھیں، انگریزی استعمار نے اکثر ملکوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا، دنیا کا کوئی بھی خطہ اس تہذیب وفکر سے آزاد نہ رہ سکا تھا، مصر جس کو یورپ کبھی فتح نہ کرسکا یورپ سے اور ثقافتی میدان میں مرعوب ہوگیا، اور اس نے نوجوانوں کی منتخبہ جماعت کو استفادہ کے لیے یورپ بھیجا، جس نے واپس آکر مغربی تہذیب وتمدن کے اختیار کرنے کی تلقین کی، مصری وزیر تعلیم طٰہٰ حسین جو مغرب ہی کے پروردہ تھے بڑے فخر سے لکھتے ہیں۔

''ہم عہد حاضر میں یورپ سے ایسا قرب اور رابطہ چاہتے ہیں جو روز بروز بڑھتا رہے یہاں تک کہ ہم لفظ اور معنیٰ، حقیقت اور شکل ہر اعتبار سے اس کا ایک حصہ بن جائیں۔''(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

''ہمیں اہل یورپ کے طریقہ پر چلنا چاہیے اور ان کی سیرت وعادات اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہم ان کے برابر ہوسکیں اور تہذیب کے خیر وشر، تلخ وشیریں، پسندیدہ وناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیق کار اور شریک حال ہوسکیں۔''(۲)

تہذیب مغرب سے مرعوبیت کی یہ انتہا ہے کہ ایک مسلمان مفکر وادیب اور مسلمان ملک کا وزیر تعلیم تقلید ونقالی اور مغرب میں فنا اور تحلیل ہوجانے کی بے باکانہ دعوت دے رہا ہے۔ اس سے عمومی طور پر پست ذہنی سطح کا پتہ چلتا ہے جس کی بنیادی وجہ یورپ سے مرعوبیت اور پوری طرح اس کے خدوخال سے ناواقفیت تھی، اس وقت اس تہذیب کے برے پہلو اور اس کی خرابیاں برسرعام نہیں ہوئی تھیں اور زیادہ تر اس کے محاسن ہی لوگوں کے سامنے آرہے تھے۔

اسلام کے لیے یہ ایک بہت بڑا تھا جس نے پوری شدومد کے ساتھ سر اٹھایا اور دیکھتے دیکھتے عالم اسلام کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

مسلمان ءومفکرین کا طرز فکر

اس نئی تہذیب کے بارے میں مسلمان ءومفکرین کے ابتداء میں ہمیں دو طبقے نظر آتے ہیں: ایک طبقہ وہ ہے جو اس تہذیب سے پوری طرح متأثر ہوگیا اور مسلمانوں کی ترقی کو اس نے اسی تہذیب کے ساتھ مربوط سمجھ لیا اور کھلے عام اس کو اختیار کرنے کی دعوت دی، وہ اس تہذیب کے مضر اثرات کو

جومسلمانوں پر پڑ رہے تھے محسوس نہ کر سکا اور اس نے مسلمانوں کی ترقی کا راز اسی میں سمجھا کہ وہ بھی نئی مہذب قوموں کی طرح اسی تہذیب میں ڈھل جائیں تا کہ دنیا میں ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جا سکے۔

اس طبقہ کے سرخیل ہندوستان میں سرسید احمد خاں تھے جنھوں نے مغربی نظام تعلیم کو پوری طرح اختیار کر لیا اور بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے مغربی تمدن کو اختیار کرنے کی ضرورت سمجھی، اس کے کمزور پہلوان کی نگاہوں سے اوجھل رہے، اس میں ان سے اتنا غلو ہوا کہ وہ عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے۔

مصر کے مفتی محمد عبدہ بھی تجدید کی اس دعوت میں سرسید احمد خاں کے قریب ہی نظر آتے ہیں، ان کی تفسیر اور فتاویٰ میں بھی ایسی تشریح وتاویل نظر آتی ہے جس سے تمدن جدید کے مطالبات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہو سکے، تاہم انہوں نے جدید نسل کو دین سے مانوس کرنے اور نظام تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی مفید خدمت انجام دی۔

سرسید کے اس طرز فکر کے خلاف سب سے پہلے مشہور شاعر اکبرالہ آبادی نے آواز اٹھائی اور اپنے مشہور مزاحیہ انداز میں مغربی نظام اور فکر پر تنقید کی۔ سرسید کے خلوص کے پورے اعتراف کے ساتھ انہوں نے ان کی تقلید مغرب کی پر جوش دعوت اور کالج کی مغربی زندگی اور فضا پر صاف صاف تنقید کی، اور اس کی کمزوریوں اور خامیوں کو نمایاں کیا۔ نوجوانوں نے ان کے کلام کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہوئے لیکن وہ تقلید مغرب کے اس تیز دھارے کو روک نہیں سکا۔ حضرت مولانا کی رائے میں اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ادب اور اصلاح کی بنیاد طنز وتعریض پر ہوتی ہے اس کی عمر اور اس کے اثرات محدود ہوتے ہیں اور وہ کوئی تعمیری انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

یورپ کے خلاف آواز لگانے والوں میں سید جمال الدین افغانیؒ کا نام بھی نمایاں ہے لیکن ان کی کوششیں زیادہ تر مغربی سامراج کو ختم کرنے، خاص طور پر مشرقی ممالک سے برطانیہ کا اقتدار ختم کرنے میں محدود رہیں، اور ان کی سرگرمیوں پر زیادہ تر سیاسی رنگ ہی غالب رہا۔

برصغیر میں اس سلسلہ میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا ہے جن کو حضرت مولانا نے جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا ہے۔

انہوں نے یورپ کے قلب وجگر میں رہ کر اس کے محاسن ومعایب کا مطالعہ کیا، اپنی نگاہوں سے اس کے خیر اور شر کو دیکھا اور پرکھا، مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور کمزور پہلوؤں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور فساد کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے اشعار میں اس کے اجزاء کو بکھیر کر رکھ دیا اور اس کا ایسا تجزیہ کیا کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، لیکن ان کی یہ صدائے بازگشت برصغیر تک محدود رہی اور پھر شعر کی زبان کے بھی کچھ حدود ہوتے ہیں، نتیجہ ظاہر تھا کہ ممالک عربیہ خاص طور پر اور ممالک اسلامیہ عام طور پر اب بھی مغربی تہذیب کے طلسم میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ ضرورت اسی طرح باقی تھی کہ کوئی اس طلسم کو پاش پاش کر سکے اور مسلمانوں کو عالمی سطح پر ان کی زبان اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے، حقائق سے آشنا کرائے اور ان کو ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کرے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں مشہور مفکر ومصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنے فاضلانہ مضامین کے ذریعہ یہ کام شروع کیا، یہ مضامین ان کے مؤقر رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونا شروع ہوئے، ان میں مولانا مودودی نے مدافعانہ لہجے کے بجائے اقدامی پوزیشن اختیار کی، اسلامی شریعت وقوانین کے ان مسائل پر بڑے مدلل مضامین لکھے جو تجدد پسندوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ان کے مضامین ورسائل سے جدید تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کے دلوں میں دین کی وقعت پیدا ہوئی اور اسلام پر ا　　دبحال ہوا۔ یہ مضامین اور رسائل عربی میں بھی منتقل کیے گئے اور یہ کام سب سے بہتر طریقہ پر مولانا مسعود عالم ندویؒ (۱) نے انجام دیا، عالم عربی میں یہ رسائل اور کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

کاش کہ یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہتا لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے قلم کا رخ ایسے موضوع کی طرف ہو گیا جس کے نتیجہ میں ان کو　　ءاہل حق کی تنقید شدید کا نشانہ بننا پڑا، اپنی مشہور کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' میں انہوں نے ثابت کیا کہ ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم زمانہ اول کے لوگوں

نے سمجھا تھا بعد میں رفتہ رفتہ ان کے اصل مفاہیم بدلتے چلے گئے اور آج جوان کی تشریح کی جاتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو زمانہ اول میں کی جاتی تھی، یہ قرآن کی وہ بنیادی اصطلاحیں ہیں جن پر اسلام کا محور گردش کرتا ہے، ان کے بارے میں یہ تصور کہ صدیوں کی صدیاں گزر گئیں اوراس کا صحیح مفہوم جانا نہ جاسکا بڑے خطرہ کی بات تھی اور رسول اللہ ﷺ کی اس پیش گوئی کے بظاہر خلاف جس میں آپ ﷺ نے صاف صاف فرمایا :

”یحملون هذا الدین من کل خلف عدو له ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاهلین“(۲)

ہر نسل کے ثقہ لوگ اس دین کے حامل ہوں گے جو اس دین میں غلو کرنے والوں کی تحریفات، اہل باطل کی تلبیسات اور جاہلوں کی تاویلات کا پردہ چاک کردیں گے۔“

پھر مولانا مودودی نے خود ان اصطلاحات کا جو اسلامی تصور پیش کیا ہے اس میں سیاسی رنگ غالب ہے اور دعوت اسلامی کا مقصد ہی اس میں ”حکومت الٰہیہ“ کے قیام کو قرار دیا ہے، اور پھر عبادت وذکر کے بارے میں انہوں نے جن خیالات اور نئی تحقیقات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ جو نسل صرف اسی فکر ومطالعہ میں پروان چڑھے گی وہ اس مزاج سے ہم آہنگ نہ ہوسکے گی جو صحبت وتربیت نبوی ﷺ کا پیدا کردہ ہے اور علی سبیل التوارث امت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ برصغیر کے ء نے خاص طور پر اس کو محسوس کیا اور یہ ضرورت سمجھی کہ اس فکر کے خلاف آواز اٹھائی جائے، وہی ء جو شروع میں ان کی تصنیفات کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے انہوں نے ضروری سمجھا کہ خالی الذہن اور غیر پختہ شعور رکھنے والے لوگوں کو ایسی کتابوں کے مطالعہ سے باز رکھنا ہی مناسب ہے جن میں فائدہ کے ساتھ ایک بڑا نقصان بھی مضمر ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

تہذیب حاضر کے بڑے وسیع اور مطالعہ کے بعد اسی وسعت و گہرائی کے ساتھ اس پر تنقید کرنے والوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ کا نام نامی سرفہرست ہے۔ حضرت مولانا نے ایسے ماحول میں تربیت پائی جو خالص ودینی ہونے کے ساتھ باہر کی دنیا سے بھی باخبر تھا۔ برادر بزرگ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ نے ندوہ اور دیوبند کے بعد ایم، بی، بی، ایس کی تعلیم مکمل کی تھی اور براہ راست انگریزوں سے پڑھا تھا، ان کی تہذیب ومعاشرت ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں کے سامنے سے گزری تھی اور اس کی اچھائیاں برائیاں انہوں نے بچشم خود ملاحظہ کیں تھیں۔ وہ اس طرح اس کے درمیان سے اپنا دامن بچا کر نکل آئے تھے کہ ان کی ظاہری وضع قطع پر بھی ادنیٰ فرق نہیں پڑا تھا۔ دوران تعلیم انہوں نے خالص اسلامی ثقافت اختیار کرکے اپنے انگریز استادوں کو بھی متأثر کیا تھا۔ ان کی ذات ”قدیم صالح“ اور ”جدید نافع“ کا بہترین سنگم تھی، وہ ایک طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اور دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن تھے تو دوسری طرف شہر کے ایک کامیاب معالج بھی تھے، مطب کی مشغولیت کی بنا پر وہ خود جس سطح پر کام کرنا چاہتے تھے اس کا موقع ان کو نہیں مل سکا، لیکن حضرت مولانا کی انہوں نے پوری ذہنی وفکری تربیت کی تاکہ وہ دنیا کے حالات کو سمجھ سکیں، تہذیب نو کا تجزیہ کرسکیں اور اسلامی مزاج کی روشنی میں علی وجہ البصیرۃ اس کا جواب دے سکیں۔

حضرت مولانا خود تحریر فرماتے ہیں :

”مغربی تہذیب ونظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب مرحوم، بی، ایس، سی۔ ایم، بی، بی، ایس، کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب وثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست وہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر تھی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کے ”سچ“ اور ”صدق“ کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنادیا۔“

مزید جن کتابوں نے اس سلسلہ میں مواد فراہم کیا ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب ”معرکہ مذہب وسائنس“

(مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ (مترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ) نے بڑی مدد کی اور اس سے بڑا مواد ملا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ کے مضامین "ترجمان القرآن" اور ان کی کتاب "تنقیحات" نے اور زیادہ وضاحت وتقویت پہنچائی۔ مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی واصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب Islam at the cross road معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشین ہوا۔"
(۱)

اس سلسلہ میں مولانا سید طلحہ حسنی صاحب کا نام بھی حضرت مولانا نے کئی جگہ لیا ہے جو مولانا کے حقیقی پھوپھا تھے، علوم جدید وقدیم میں ان کو درک تھا، اورینٹیل کالج (لاہور) میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ ان کی صحبتوں سے بھی حضرت مولانا نے فائدہ اٹھایا۔

حضرت مولانا کی نشو ونما بھی اس زمانے میں ہوئی تھی جب تحریک آزادی اور دینی جوش وخروش کا عہد شباب تھا اور لکھنؤ کو اس تحریک کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل تھی، یہ سب واقعات مولانا کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے تھے۔

مولانا کی نگاہ بصیرت

حضرت مولانا کی نگاہ بصیرت نے ان خطرات کو بہت دور تک محسوس فرمالیا تھا اور ان کے فہم وفراست نے بہت سے ان حقائق کا ادراک کرلیا تھا جو عام طور پر نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ اس میں مولانا کی خاص ماحول میں تعلیم وتربیت کے علاوہ ان کی خداداد بصیرت وفراست کا بنیادی حصہ تھا۔

حضرت مولاناؒ نے وسعتِ مطالعہ اور اپنی بصیرت سے محسوس فرمالیا تھا کہ مسئلہ صرف ایک تہذیب یا ثقافت کا نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت پورا ایک فلسفہ ہے جو دین کے انکار پر مبنی ہے، مستقل عقائد ہیں جو سراسر الحاد وکفر تک لے جاتے ہیں، اگر کوئی آنکھ بند کرکے اس تہذیب کو اختیار کررہا ہے تو اس کا ایمان خطرہ میں ہے، یہ ایسا الحاد وارتداد ہے جو مغربی تہذیب کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ پھیل رہا ہے، اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ آدمی اس کو محسوس نہیں کرپاتا اور اس کے شکنجے میں جکڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک مضمون میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

"کچھ عرصہ سے دنیائے اسلام کو ایک ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے جس نے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لہر پیدا کردی ہے، یہ اپنی شدت وقوت اور وسعت وعمق میں اب تک کی تمام ارتدادی تحریکوں سے بازی لے گیا ہے، کوئی ملک نہیں ہے جو اس کی غارت گری سے بچا ہو بلکہ ملک تو ملک خاندانوں میں ایسے مشکل سے تھوڑے بہت ہوں گے جو اس کی دست برد سے محفوظ ہوں۔ یہ وہ ارتداد ہے جو شرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی اور تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے، یہ سب سے ارتداد ہے جو عہد رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے۔" (۱)

اس ارتداد کی اندیشہ ناکی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"بلاشبہ یہ ارتداد ہے لیکن وہ مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرسکا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسا یا ہیکل نہیں جاتا اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے، نہ معاشرہ اس پر چونکتا ہے کہ احتساب وعتاب کی صورت پیش آئے اور فصل وانقطاع کا معاملہ درپیش ہو، وہ بدستور اسی سوسائٹی اور معاشرہ میں رہتا ہے، اپنے تمام حقوق حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرہ پر حاوی ہونے تک کا اس کو موقع مل جاتا ہے۔ یہ عالم اسلامی کا نہایت اہم مسئلہ اور بڑا قابل فکر معاملہ ہے۔" (۱)

یہ حضرت مولانا کی نگاہ بصیرت تھی کہ انہوں نے اس تہذیب کی بنیادوں کو دیکھا اور محسوس کرلیا کہ جو تخم زمین پر ڈالا گیا ہے اس کا درخت دیکھنے میں خواہ ہی سرسبز وشاداب نظر آئے لیکن اس کی زہر آلود ہوا اور مسموم فضا کے نیچے جو بھی آرام کرلے گا وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے اور اس ایمان کش تہذیب کا صحیح تجزیہ کرکے اس ملحدانہ فلسفہ کا قلع قمع کرنے کو انہوں نے وقت کا سب سے بڑا اجہاد

قرار دیا۔اسی مضمون میں آگے تحریر فرماتے ہیں :

''آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لا دینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے جو عالم اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب و مرکز پر حملہ کیا جائے۔ وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے اساسیات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالت محمدی ﷺ پر وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے اور اس کی عقلیت اور ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل و دماغ میں گھر کر گئے ہیں ان سے علم وعقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔''(۱)

مولانا کی نگاہ میں سب سے بڑا خطرہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے اپنی متعدد تصانیف اور رسائل میں اس تہذیب کو اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ اپنی مشہور تصنیف ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں تحریر فرماتے ہیں :

''انیسویں صدی ی کے وسط میں عالم اسلام کو ایک بہت ہی نازک، پیچیدہ اور اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا، اس مسئلہ کے بارے میں اس کے صحیح رویہ اور نقطۂ نظر ہی پر ایک مستقل اور آزاد دنیا کی حیثیت سے اس کی شخصیت اور وجود کا انحصار تھا۔

یہ تازہ دم، زندگی اور نشاط، حوصلہ وعزم اور ترقی و وسعت کی صلاحیت سے بھرپور مغربی تہذیب کا مسئلہ تھا، جس کا شمار تاریخ انسانی کی طاقت ور ترین اور وسیع ترین تہذیبوں میں کیا جانا چاہیے اور جو درحقیقت (اگر غائر نظر سے دیکھا جائے) ان اسباب وعوامل کا ایک قدرتی نتیجہ ہے، جو عرصہ سے تاریخ میں اپنا کام کر رہے تھے، اور مناسب وقت پر اس نئی شکل میں ظاہر ہونے کے منتظر تھے۔

عالم اسلام سب سے زیادہ اس خطرہ کی زد میں تھا، اس لیے کہ کارگاہ حیات سے قدیم مذاہب کی کنارہ کشی کے بعد اسلام دینی واخلاقی دعوت کا تنہا علمبردار، اور معاشرۂ انسانی کا واحد نگراں اور محتسب رہ گیا تھا، بہت سے وسیع، سیر حاصل اور زرخیز ممالک اسی رقبہ میں واقع تھے چنانچہ اس مادی اور میکانکی تہذیب کے چیلنج کا رخ بہ نسبت کسی دوسری قوم اور معاشرہ کے زیادہ تر عالم اسلام ہی کی طرف رہا۔''(۲)

اس تہذیب کے اجزائے ترکیبی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''اس تہذیبی مجموعہ میں ناقص اجزاء بھی تھے اور مکمل بھی، مضر بھی اور مفید بھی، صحیح بھی اور غلط بھی، اس میں علم کے ان بدیہیات کے ساتھ جو ہر شبہہ سے بالاتر ہیں، ایسے غلط قیاسات، خیالات و افکار اور بزعم خود ایسے فیصلے بھی شامل تھے جن میں بحث ومباحثہ اور غور وخوض کی پوری گنجائش موجود ہے، ان میں ایسے نتائج بھی تھے، جو بڑے غور وخوض اور مطالعہ وتجربہ کا نچوڑ تھے اور ایسے بھی تھے جن کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا، وہ اجزاء اور عناصر بھی تھے جو کسی خاص ملک اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں مثلاً تجربی علوم، اور وہ بھی جن میں مغربی تہذیب کی مقامی روح پوری طرح نمایاں تھی، اور مغربی ماحول اور معاشرہ کا ان پر گہرا اثر تھا، اور وہ ان تاریخی انقلابات اور حوادث کا نتیجہ تھے جن سے مغربی اقوام کو اپنے دائرۂ عمل اور مرکز میں گزرنا پڑا، وہ بھی تھے جن کا دین وعقائد سے گہرا تعلق تھا، اور وہ اجزاء بھی تھے جن کو سرے سے مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔''(۱)

تین موقف

اس نئی پیچیدہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے مولانا نے تین موقف ذکر فرمائے ہیں : ایک خالص منفی رویہ ہے، دوسرا خالص مثبت اور تیسرا وہ معتدل موقف ہے جس کو پوری نزاکت اور توازن کے ساتھ کم ہی لوگ اختیار کر سکے ہیں۔ اور یہ حضرت مولانا کا خاص امتیاز ہے۔

عام طور پر ءودانشوروں نے یا تو پوری طرح یورپ کی شاگردی اختیار کر لی اور یا اس کی کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانا بھی حرام اور ناجائز سمجھا، بقول اکبر

الٰہ آبادی مرحوم کے

؎ ادھر یہ ضد ہے کہ لیمن بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ ہٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا

حضرت مولانا نے عالم اسلام کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں طریقۂ فکر کس قدر نقصان دہ ہیں؟! پہلے موقف کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اس موقف کا قدرتی نتیجہ عالم اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، اس سے عالم اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہوجائے گا اور وہ ایک محدود حقیر جزیرہ بن کر رہ جائے گا جس کا گرد وپیش کی دنیا سے کوئی پیوند نہیں ہوگا، سمندر میں ایسے بے شمار جزیرے ہوسکتے ہیں لیکن خشکی میں اس طرح کے جزیروں کی گنجائش نہیں۔''(۱)

پھر حضرت مولانا نے اسلامی نصوص کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور اسلام قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت مولانا نے ان ملکوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا اور کس درجہ ان کو دینی اور تمدنی نقصان اٹھانا پڑا۔

دوسرے موقف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

دوسرا موقف شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت منداور سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار و سعادت مند شاگرد کا ہے، جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا، اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی، مشینی اور اپنا مخصوص مزاج وذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرلے اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار وخیالات اور سیاسی واقتصادی نظام پر ایمان لے آئے (جو عالم اسلام کے ماحول سے بہت دور، نہایت مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی تشکیل اور پرورش ہوئی) پھر اپنے ملک میں اس کی مکمل نقل کرنا چاہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔''(۲)

ظاہر ہے کہ اس موقف کو وہی اختیار کرسکتا تھا جو اس تہذیب کی گہرائی تک نہ پہنچا ہو یا اس کے ایمان کی انگیٹھی سرد ہوچکی ہو۔

متوازن اور صحیح طرز فکر

تیسرا موقف وہ متوازن اور صحیح موقف ہے جس کو اختیار کرنے کی مولانا نے عالمِ اسلام کو دعوت دی ہے۔ یہی وہ طرز فکر ہے جو عالم اسلام کو مغربیت اور اسلامیت کی اس کشمکش میں پورا تحفظ فراہم کرسکتا ہے اور اس کے لیے ترقی کی راہوں کو کھول سکتا ہے۔

اس موقف کو اختیار کرنے والے مرد کامل کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا رقم طراز ہیں :

''جو مغربی تہذیب کا جرأت اور ا د اور یقین کے ساتھ سامنا کرے اور اس تہذیب جدید کے مختلف سانچوں، مختلف مکاتب فکر اور راستوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جس میں وہ تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے بالاتر نظر آئے اور ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو، حقائق اور وسائل، قوت اور مغز کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ الجھے۔''(۱)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

''وہ عالی دماغ، حوصلہ مند انسان، جو مغربی تہذیب اور اس کے تمام نظریات، انکشافات اور قوتوں کے ساتھ خام مال (Raw Material) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی طاقت اور تہذیب کی عمارت تعمیر کرے، جو ایک طرف ایمان، اخلاق، تقویٰ، رحم دلی اور انصاف پر قائم ہو۔ دوسری طرف اس میں اس کی مخصوص ذہانت، قوت ایجاد اور جدت فکر جلوہ گر ہو، وہ مغربی تہذیب کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ تکمیل وترقی کے آخری مراحل سے گزر چکی ہے اور اس پر آخری مہر لگ چکی ہے اور اب اسی میں کسی ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں ہے اور اس کو

جوں کا توں اس کے سارے عیوب کے ساتھ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے بلکہ وہ اس پر علحدہ علحدہ اجزاء کی حیثیت سے نظر ڈالے، جس چیز کو چاہے رد کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار کرے، اور پھر اس سے زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدہ، اس کے مبادی اور اصول اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔'' (۱)

حضرت مولانا نے جس مرد کامل کی تصویر کشی فرمائی ہے اور تہذیب مغرب کے سلسلہ میں جو فکر پیش کی ہے خود وہ اس کے پرجوش داعی اور ترجمان نظر آتے ہیں، اور یہ دعوت فکر وعمل ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

حضرت مولانا کی امتیازی خصوصیت

مغربی تہذیب کے بارے میں حضرت مولانا کے طرز فکر اور دعوت فکر وعمل کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں تین ایسی بنیادی خصوصیات نظر آتی ہیں جو معاصر داعیوں اور مفکروں کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ اہم خصوصیت اس تہذیب کے نقد واعتراف میں حضرت مولانا کی فکر کا توازن ہے جو شاید ہی اور کہیں نظر آئے۔ دوسری خصوصیت اس تہذیب کی تنقید اور اس کے نقصانات کو واضح کرنے میں حضرت مولانا کی گہرائی ہے۔ مولانا کی تیسری خصوصیت اس کام میں ان کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ انہوں نے مختلف ملکوں کے حالات کا جائزہ لیا ہے اور وہاں کے تقاضوں، ضروریات اور لوگوں کی نفسیات سمجھ کر علاج تجویز فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا اس تہذیب اور اس کے پس منظر اور اس کے رجحانات سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں جو صرف مطالعہ پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہے۔

ذیل میں حضرت مولانا کے ان تینوں امتیازات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے:

مغربی تہذیب پر گہرائی کے ساتھ تنقید

حضرت مولانا کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے اس تہذیب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، اس کی بنیادی کمزوریوں اور نقائص کی نشاندہی فرمائی ہے، اس کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دی ہے اور ایسے بہت سے بنیادی حقائق پیش فرما دیئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر ایک انصاف پسند انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور صاف نظر آنے لگتا ہے کہ یہ تہذیب اپنے اندر نوع انسانیت کے لیے کیا کیا مضر اثرات رکھتی ہے؟!

حضرت مولانا کی یہ خصوصیت سب سے زیادہ ان کی مشہور ترین تصنیف ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) میں نمایاں ہے۔ حضرت مولانا کا یہ وہ نیا اور اچھوتا انداز نگارش ہے جس میں مؤرخانہ تحقیق کی امانت اور لطافت ونزاکت کے ساتھ دعوت وفکر کی بھی جلوہ نمائی ہے، اور کتاب ایسے اسلوب میں لکھی گئی ہے کہ وہ عقل اور قلب دونوں کو یکساں مہمیز کرتی ہے اور غذا فراہم کرتی ہے، معاصر مفکرین وداعیوں نے کھل کر اس کتاب کی داد دی، سید قطبؒ جیسے مفکر وداعی نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

اس موضوع پر تمام قدیم وجدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' خاص مقام رکھتی ہے۔'' (۱)

اس کتاب میں صرف مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس کے اسباب کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور دنیا پر پڑنے والے اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مغربی تہذیب کا شجرۂ نسب

اس کتاب کے پانچویں باب میں مولانا نے مغربی عہد کا تذکرہ کیا ہے، جس میں مغربی تہذیب کے تانے بانے بیان کیے ہیں اور اس کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تہذیب کے شجرۂ نسب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''بیسویں صدی کی مغربی تہذیب (جیسا کہ بعض سطحی النظر سمجھتے ہیں) کوئی ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں ہوئی ہے، دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، اس کا نسبی تعلق رومی اور یونانی تہذیب سے ہے، ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ اور　و　سرمایہ چھوڑا تھا اس کے حصہ میں آیا، اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئے۔''(۱)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

''اس بنا پر ضروری ہے کہ پہلے یونانی اور رومی تہذیب سے واقفیت پیدا کریں اور ان کے مزاج اور روح کو پہچان لیں تا کہ ہم بصیرت کے ساتھ بیسویں صدی کی مغربی تہذیب پر تنقید کرسکیں۔''(۲)

یونانی تہذیب کی حضرت مولانا نے چار خصوصیات بتائی ہیں جن کا ذکر باب کے آغاز میں کیا جاچکا ہے۔ پھر تحریر فرماتے ہیں :

''ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا ''مادّیت'' کا لفظ کافی ہے، پس یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز ''مادیت'' ہے۔ یونانیوں کا علم، فلسفۂ شاعری حتیٰ کہ دین، سب ان کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کرسکے، انہوں نے ان صفات کے بت تراشے اور ان کے لیے معبد تعمیر کیے تا کہ محسوس طریقہ پر ان سے تعلق رکھیں، ان کے ہاں ایک روزی کا دیوتا تھا، ایک رحمت کا اور ایک قہر وعذاب کا، پھر ان کی طرف انہوں نے مادی جسم کی تمام خصوصیات اور متعلقات منسوب کیے اور ان کے گرد قصے کہانیوں کا ایک جال پھیلا دیا۔''(۳)

مغربی　ء کی تحریروں سے اقتباسات دے کر حضرت مولانا نے ثابت کیا ہے کہ خود ان کو مادیت کے اس　کا اعتراف ہے، پھر حضرت مولانا اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''لیکن یہ حقیقت قطعاً قابل استعجاب نہیں، مغرب کی مادہ پرست اور خوگر محسوسات فطرت ومزاج کے علاوہ یونانیوں کا فلسفۂ الٰہیات اور اس کے عقائد کی ساخت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی کہ خشوع وخضوع، انابت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی، ذات باری کے تمام صفات، ہر قسم کے اختیار فعل وتصرف اور خلق وامر کی نفی کرنے اور اس کو بالکل بے صفت اور معطل قرار دینے اور اس کائنات کی پیدائش وانتظام کو اپنے خود تراشیدہ اور مفروضہ عقل فعّال کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ کرنے کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ زندگی میں خدا کی کوئی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق اور دلچسپی باقی نہ رہ جائے، نہ اس سے کوئی امید ہو اور نہ اس کا کوئی خوف، نہ دل میں اس کی ہیبت ہو اور نہ دلچسپی، اور نہ ضرورت ومصیبت کے وقت اس سے دعا والتجا ہو، اس لیے کہ وہ اس فلسفہ کے مطابق ایک بالکل معزول ومعطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت، وہ عقل اول پیدا کرکے عالم سے بالکل بے تعلق وکنارہ کش ہوگیا، اس لیے اس عقیدہ کے ماننے والوں کی زندگی　ایسی گزرتی ہے، اور گزرنی چاہیے کہ گویا خدا نہیں ہے اور منکرین خدا کی زندگی سے سوائے اس تاریخی بیان کے کہ خدا نے عقل اول کو پیدا کیا ہے اور کسی حیثیت سے ممتاز نہیں، پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانیوں میں خشوع اور خضوع کی کمی تھی اور ان کی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالبِ بے روح سے زیادہ نہ تھے اور وہ یہ کہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے، اس لیے کہ تاریخ میں آدمی سیکڑوں صنّاعوں اور موجدوں کا تذکرہ پڑھتا ہے، لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع اور خضوع اور ان سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا جب خدا کو اس کائنات میں متصرف اور کارفرما اور اپنے کو اس کا محتاج سمجھتے۔''
(۱)

اس فکر کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ نکل کر رہا، اخلاقی انحطاط اور انسانی پستی میں یہ تمدن ایک متعفن لاش کی طرح سڑگل گیا، کسی قسم کے اخلاقی اصول واقدار

باقی نہیں رہے اور زندگی لطف اندوزی، تمتع اور بوالہوسی کا نام بن گئی۔

رومی اس تہذیب کے وارث ہوئے علم وتمدن میں انہوں نے پوری طرح یونانیوں کی شاگردی اختیار کی، جس مادیت پر ایرانیوں کا خمیر تیار ہوا تھا اس مادیت پر رومیوں کا خمیر بھی اٹھا۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں :

''اس طرح علم وادب اور عادات واخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا فلسفہ اور　بلکہ یونانی نفسیات رومیوں میں منتقل ہوگئی اور ان کے رگ و پے میں پیوست ہوگئی، یوں بھی رومی اپنی مغربی فطرت ومزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں دونوں کے درمیان بڑی حد تک مشابہت تھی، محسوسات پر رومی بھی یقین کرنے کے عادی تھے، زندگی کی قدر و قیمت میں یہاں بھی اتنا ہی غلو اور افراط تھا، دینی عقائد وحقائق کے بارے میں یہ بھی بہت ضعیف الایمان اور آزاد خیال تھے، مذہبی نظام اور مذہبی اعمال ورسوم کا کوئی خاص احترام اور وقار نہ تھا، قومیت اور وطنیت میں یہاں بھی شدت اور مبالغہ پایا جاتا تھا، مزید یہ کہ طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہنچا ہوا تھا''(۱)

حضرت مولانا نے ایرانی اور رومی تمدن کا نقشہ ان ہی کے فضلاء ومصنفین کے حوالوں سے ایسا پیش کیا ہے جس سے اس کے پورے اجزاء سامنے آجاتے ہیں۔ حضرت مولانا کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق وواقعات حوالوں کے ساتھ پیش کرتے چلے جاتے ہیں، اس کے نتائج اور اثرات مطالعہ کرنے والا خود محسوس کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جو بات وہ اپنی زبان سے کہنا چاہتے ہیں ان مقدمات کا مطالعہ کرنے والا وہ بات خود اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور خود بخود اس کے ذہن میں ایک خاکہ ابھرتا ہے۔

چوتھی صدی　ی کے آغاز میں　ئیت نے سلطنت روما پر اپنا جال پھینکا اور قسطنطین تخت سلطنت پر بیٹھا جس نے　ئیت قبول کرلی تھی لیکن خود اپنے دام میں صیاد آگیا، بجائے اس کے کہ　ئیت اس　سلطنت کی رہنمائی کرتی وہ خود اس کا لقمہ تر بن گئی، سینٹ پال کی تحریف وتلبیس کے بعد جو بچا تھا وہ قسطنطین کی مادیت کی نذر ہوگیا، کچھ ہی عرصہ میں اس مادیت سے عاجز ہوکر کچھ مذہب کے نام لیواؤں نے رہبانیت کی دعوت دی اور پھر ایک طبقہ پر اس کا ایسا جنون سوار ہوا کہ عورت کی شکل دیکھنا بھی گناہ تھا، مائیں ممتا کو ترس گئیں، توالد وتناسل کا تناسب خطرناک حد تک گر گیا۔ اس کے بالکل برخلاف دوسرا طبقہ لذت اندوزی اور عیش کوشی کی آخری سرحدیں چھور رہا تھا۔ بالآخر اس رہبانی جنون پر لذت پرستی ہی غالب آئی اور کلیسا ایسے ہاتھوں میں چلا گیا جو خالص دولت پرست اور نفس پرست لوگ تھے، دولت اور اقتدار کے لیے وہ ہر کچھ کرنے کو تیار تھے، عوام کو انہوں نے اپنی عزت ووقار باقی رکھنے کے لیے توہمات میں جکڑ دیا، حصول علم کو گناہ قرار دے دیا اور ایک عرصہ تک پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا رہا۔

دین ودنیا کی تفریق

طلوع اسلام کے بعد جب اسلامی تہذیب کا غلغلہ بلند ہوا تو اندلس کے راستہ سے اس کی روشنی یورپ میں بھی داخل ہوئی، شروع میں علم کا شوق جن افراد میں پایا جاتا تھا وہ خفیہ طور پر اندلس میں علم حاصل کرتے تھے اور یورپ کے کلیسا کی طرف سے ان کے ساتھ سخت معاندانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا آہستہ آہستہ یہ رجحان بڑھتا رہا یہاں تک وہ تیرہویں صدی میں عام ہوگیا، کلیسا کی علم دشمنی کی وجہ سے مذہب وعقلیت کی کشمکش شروع ہوئی، عرصہ تک یہ معرکہ گرم رہا بالآخر کلیسا کو شکست ہوئی اور خالص مادی تمدن کا فروغ شروع ہوا، یورپ ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہوا تھا اس لیے اس نے پوری تلافی کرنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ کلیسا اور مذہب سے طویل کشمکش اور بالاخر اس پر فتح حاصل کرنے کے بعد یورپ نے ترقی شروع کی تھی اس لیے اس تمدن اور تہذیب کی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر پڑی۔

یورپ کی کوتاہ نظری

حضرت مولانا نے قدرے تفصیل سے شواہد کے ساتھ یہ حقائق پیش فرمائے ہیں، پھر تحریر فرماتے ہیں :

''ان روشن خیالوں اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر وسکون، مطالعہ اور غور کی قوت اور عقل واجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان امتیاز کرسکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک ارباب کلیسا کا جمود؟! جہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بےتعلقی اختیار کرلینا کہاں تک حق بجانب ہے؟! لیکن غصہ اور اہل مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسے کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے، انہوں نے دین کے ساتھ کوئی رواداری اور مفاہمت پسند نہیں کی۔

ان میں اتنی طلبِ صادق اور اپنی قوم کی خیر خواہی، فراخ حوصلگی بھی نہ تھی کہ وہ دین اسلام کا مطالعہ کرتے جو ان کی بہت سی معاصر قوموں کا دین تھا اور جو نہایت آسانی کے ساتھ اس مخمصہ اور مذہب وعقلیت کی اس غیر ضروری کشمکش سے نجات دیتا جو معقول و مستحسن امور کا مطالبہ کرتا، غیر معقول اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتا، دنیا کی بےضرر اور پاک لذتوں اور فوائد کی ان کو اجازت دیتا، مضر اور قابل نفرت اشیاء کو ممنوع قرار دیتا اور ان بے جا زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹ دیتا جو تحریف شدہ مذاہب اور تشدّد پسند اہل مذہب اور اہل حکومت نے ان کے جسم میں ڈال رکھی تھیں۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ. (۱)

(محمد رسول اللہ ﷺ) ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، پسندیدہ چیزیں حلال کرتے ہیں، گندی چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں، اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں)

لیکن قومی عصبیت اور ان دیواروں کی وجہ سے جو صلیبی جنگوں نے ی مغرب اور اسلامی مشرق کے درمیان اور ارباب کلیسا کی افترا پردازیوں نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف کھڑی کردی تھیں نیز مطالعہ وتحقیق کی محنت برداشت نہ کرنے اور موت کے بعد کی زندگی اور نجات اخروی سے آزاد و بےفکر ہونے کی وجہ سے انہوں نے اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

اس میں کچھ دخل مسلمانوں کی تبلیغی کوتاہیوں کو بھی ہے کہ انہوں نے صدیوں یورپ جیسے اہم براعظم میں اسلام کی نشر واشاعت اور اس کے تعارف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، حالانکہ اسلامی حکومت کے عروج اور یورپ کی سلطنتوں سے معاصرانہ اور مساویانہ تعلقات ہونے کی وجہ سے ان کو اس کے مواقع حاصل تھے۔''(۱)

مکمل مادیت کی طرف

''غرض اہل یورپ ایسے نازک موقع پر اسلام کی رہنمائی اور اس کی مسیحائی سے محروم رہے۔

بہر حال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آگیا اور یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہوگیا، خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات وذہنیت، اخلاق واجتماع، علم وادب، حکومت وسیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آگئی، اگرچہ یہ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں اس کی رفتار سست تھی لیکن قوت وعزم کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت کرنی شروع کی۔''(۲)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

اسی زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف، ادیب، معلم اجتماع اور سیاسی پیدا ہوئے جنھوں نے مادیت کا صور پھونکا اور اہل ملک کے دل ودماغ میں مادہ پرستی کے بیج بودیئے، ئے اخلاق، اخلاق کی مادی تشریح کرتے تھے، کبھی فلسفہ کی افادیت کی

اشاعت کرتے اور کبھی لذتیت کی، میکاولی (Machiavelli) (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء) جیسے اہل سیاست نے دین وسیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے دی تھی، اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں، پبلک اور پرائیویٹ۔ اور طے کر دیا تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت ہی ہے تو وہ محض انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس کو امورسیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے، حکومت ہر چیز پر مقدم اور ہر شے سے بیش قیمت ہے۔ مذہب ی کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، ہماری دنیاوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں، مذہبی اور نیکوکار انسانوں کا وجود حکومت کے لیے کچھ مفید نہیں، اس لیے وہ دین کے احکام کے پابند ہوتے ہیں، اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتے، بادشاہوں اور حکام کو لومڑیوں کے صفات اختیار کرنے چاہئیں اور اگر حکومت کا فائدہ ہوتا ہو اور کوئی سیاسی مصلحت مقتضی ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب دہی، خیانت اور نفاق میں پس وپیش نہیں کرنا چاہیے، یہ دعوت وتبلیغ پورے طور پر مؤثر اور کامیاب ہوئی اور وطنیت وقومیت (جو مذہب قدیم کی جگہ لے رہی تھی) نے بھی اس کی پوری امداد کی۔

مصنّفین اہل قلم اور اہل دماغ نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی، اور خطابت وشاعری سے قدیم اخلاقی اور اجتماعی نظامات کے خلاف سارے ملک میں ایک بغاوت برپا کر دی، انھوں نے معصیت کو خوش نما اور دل فریب بنا کر پیش کیا۔ طبیعتوں کو ہر قید وبندش، فرد کو ہر ذمہ داری وجواب دہی سے آزاد ہونے کی اور مطلق آزادی وبے قیدی کی کھلی تبلیغ کی، زندگی سے پورے پورے تمتّع، مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی اور اس زندگی کی قیمت میں بڑے غلو اور مبالغہ سے کام لیا، نقد لذت اور ظاہر ومحسوس مادّی نفع کے سوا ہر چیز کا انکار وتحقیر کی۔''(۱)

یونانی ورومی تہذیب کا نیا ایڈیشن

''اس طرح سے انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی زندگی بت پرست یونان اور روماں کی جاہلی زندگی کا مرقع بن گئی، یہ گویا اس کا نیا ایڈیشن تھا جو انیسویں صدی میں نئے اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا۔ یونان اور روما کے جن نقوش کو مشرقی یت نے مدھم کر دیا تھا انیسویں صدی کے نقاشوں نے ان کو پھر اجاگر کر دیا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، آج کی مغربی قومیں انہیں یونانی، رومی اور مغربی اقوام کی جائز وارث اور خلف الرشید ہیں، موجودہ مغربی تہذیب اور قدیم یونانی اور رومی تہذیب میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یورپ کی موجودہ مذہبی زندگی بھی روحانیت اور باطنی کیفیت سے اسی طرح عاری ہے جیسے یونانیوں کی مذہبیت تھی، مذہبی کمزوری، خشوع وخضوع اور مذہبی سنجیدگی کی کمی، زندگی میں لہوولعب کی کثرت کا بھی وہی حال ہے جو یونان میں تھا اور یہ نتیجہ ہے ئے طبعیات وحکمت کے ان نظریات اور تحقیقات کا جنھوں نے یورپ میں پوری مقبولیت حاصل کر لی اور دین ومذہب کی پوری پوری جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح زندگی کی ہوس، لذت طلبی اور ذوّاقی اور دنیا میں شوق گل چینی کی بھی بعینہٖ وہی کیفیت ہے جو سقراط نے اپنے زمانے کے جمہوری نوجوان کی بیان کی ہے۔ نیز مذہبی شک و تذبذب، دینی نظام اور مذہبی فرائض ورسوم کے بے وقعتی میں بھی یورپ، یونان وروما سے پیچھے نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ ئیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے، مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اس کی قدم قدم پر تصدیق ہوتی ہے۔''(۱)

تنقید کا وسیع دائرہ

حضرت مولانا نے تاریخی حقائق اور مغربی مفکرین کے اعترافات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مغربی تہذیب کا بنیادی روگ مادہ پرستی ہے جس نے اس کو مذہب واخلاق سے صرف دور ہی نہیں بلکہ بیزار کر دیا ہے۔ یہ چیز اس کو یونانی ورومی تہذیب سے وراثت میں ملی، پھر کلیسا سے کشمکش نے اس کو دوآتشہ کر دیا۔ حضرت مولانا نے اس سلسلے میں ادّعائی اسلوب نہیں اختیار کیا، بلکہ دلائل کی روشنی میں منطقی انداز بحث اختیار کیا ہے اور اس کو انسانیت کے لیے نقصان دہ رجحان قرار دیا،

زر پرستی وخدافراموشی

مادہ پرستی کے بنیادی نقص کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت مولانا نے اس کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے زر پرستی کا عنوان قائم کر کے مغربی مصنّفین کے اعترافات نقل فرمائے ہیں جس کی انتہا ایک ممتاز امریکی اخبار نویس کا یہ اقتباس ہے :

''انگریز ہفتہ میں چھ روز تو پرستش بنک آف انگلینڈ میں کرتا رہتا ہے صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رخ کرتا ہے۔''(۱)

ان کی خدافراموشی اور خودفراموشی کی مثال ایک ہندوستانی مغرب زدہ کی زبانی نقل فرماتے ہیں جس کا عنوان ہی ''لندن کی ایک رات'' ہے، یہ ۱۹۴۰ء،۱۹۴۱ء کا قصہ ہے جب شہر پر حملے ہورہے تھے۔ وہ لکھتا ہے :

''اس رات ہم سب دوست احباب کئی دن اور کئی رات کے متواتر حملوں سے تنگ آکر ایک نہایت پرتکلف ملی جلی ہندوستانی انگریزی دعوت کے انتظام میں مصروف تھے، مالکہ مکان نے اپنا باورچی خانہ اور اس کا سب سامان ہمارے حوالہ کردیا تھا اور اوپر کا بڑا کمرہ بھی ناچ کے لیے خالی کردیا تھا، کوئی پچیس عورتیں اور مرد سب نے مل کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا، کھا پی کر ہم لوگ ناچ رہے تھے کہ یکا یک خطرہ کا سائرن بجا۔ پہلے تو ایک دم سے خاموش ہوگئے مگر ناچ بند کیے بغیر ایک بولا: کیا صلاح ہے؟ ایک لڑکی نے جواب دیا ناچتے رہیں گے، چنانچہ ہم سب ناچتے رہے اور گانوں اور قہقہوں سے سارا مکان تو کیا سارا محلّہ گونجنے لگا۔''(۲)

مغرب کے مصنّفین کے یہاں اس کا نام استقلال نفس اور قوت قلب ہے، اس پر ان کو فخر ہے جب کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہی قساوت ، غفلت، مدہوشی وخدافراموشی ہے۔

یہ مغربی فکر قدیم یونانی ورومی طرز فکر کا نیا ایڈیشن ہے۔ تاریخ کی روایت ہے کہ پامپی آئی کا کوہِ آتش فشاں جب پھٹا ہے تو وہ دن کا وقت تھا اور لوگ ایمفی تھیٹر میں بیٹھے ہوئے ظالمانہ لہوولعب میں مشغول تھے۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ مادیت کی روح ان میں ایسی سرایت کرچکی ہے کہ ان کے ہر نظام میں وہی جاری ساری نظر آئے گی حتیٰ کہ اس روحانی تحریک جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے کی روح بھی مادیت ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ عالم روحانیت کے عجائبات کی سیر کی جائے، اس کے اسرار معلوم کیے جائیں اور تفریح وتسکین نفس کا سامان بہم پہنچایا جائے، وہ جانیں بھی دیتے ہیں تو خالص مادی اغراض کے لیے۔

حضرت مولانا کے خیال میں یہ ایسا ''اقتصادی وحدۃ الوجود'' ہے کہ کسی لمحہ وہ اس سے علاحدہ نہیں ہوسکتے، ان کے یہاں سے ہر طرف سے ''**لاموجود الا البطن والمعدة**'' کی صدائیں بلند ہورہی ہیں پھر ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ دراصل انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے، سارے یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے، اسی ذہنیت کے نتیجہ میں انگلستان میں ایک نئی نسل پیدا ہورہی ہے جو انسانوں کی خانگی زندگی کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہے، وہ صرف حیوانات کے گلہ کی زندگی ہی سے واقف ہے۔

قومیت ووطنیت اور اس کے نقصانات

دینی انحطاط اور اصول واخلاق کے زوال کے نتیجہ میں قومیت ووطنیت کے جذبہ کو فروغ ہوا۔

حضرت مولانا کی نظر میں اس کا پہلا اثر یہ پڑا کہ پورا یورپ مشرق کے مقابلہ میں ایک حریف کیمپ بن گیا اور اس میں ایسا تکبر پیدا ہوگیا کہ دوسری قومیں اس کی نظر میں حقیر بن گئیں۔ انہوں نے طے کرلیا کہ حکومت ان ہی کا حق ہے، زندگی اور برتری اور کسی کا حق نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں :

''قوم پرستی کا تخم ایک ہی طرح کے برگ وبار لاتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم، قوم پرستی پر ایمان رکھتی ہو اور دست درازی نہ کرتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو اور اپنے سوا دوسروں کی تحقیر وتنقیص سے پاک ہو۔''(۱)

ابھی تازہ واقعہ یہ ہے کہ امام حرم مکی شیخ عبدالرحمٰن السدیس کوصرف اس لیے ایک یورپی ملک نے ویزا دینے سے انکار کردیا کہ انہوں نے یہودیوں کی مذمت میں خطبہ میں چند الفاظ کہہ دیے تھے، اس کا کہنا یہ تھا کہ یہودی سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور سامیوں پر تنقید ممنوع ہے۔ سامیت کا اطلاق صرف یہودیوں پر کیا جاتا ہے، اس لیے کہ ہٹلر نے یہ تعبیر استعمال کی تھی۔

نفرت اور خوف کو حضرت مولانا نے قوم پرستی کے ضروری عناصر میں شمار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک کہ قوم کے لیے کوئی چیز نفرت کرنے کے لیے اور کچھ ڈرنے کے لیے نہ ہو چنانچہ قومی رہنما نفرت اور خوف کے ذریعہ سے اس کے جذبات برانگیختہ کرتے رہتے ہیں اور اس کی دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان واشتعال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ نفرت اور خوف کی آگ بجھنے نہیں دیتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا کر چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بڑھا کر اور کسی نہ کسی حقیقی یا فرضی حریف کو سامنے لا کر قوم کے جذبۂ نفرت وخوف کو زندہ اور متحرک رکھتے ہیں اور اسی میں اپنی حکومت یا قیادت کی زندگی اور اپنی بقا سمجھتے ہیں۔''(۲)

یہ حضرت مولانا کی ساٹھ سال پہلے کی تحریر ہے اس کے بعد یورپ وامریکہ کے سیاسی وانقلابی اقدامات اور دوسری قوموں کے خلاف جارحانہ کاروائیوں سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ حضرت مولانا نے نصف صدی پہلے جن خطرات کا خدشہ ظاہر فرمایا تھا وہ حقائق کی شکل میں سامنے آرہے ہیں۔

اسی موضوع کو جب حضرت مولانا مزید پھیلا کر بیان فرماتے ہیں تو آج کے یورپ وامریکہ کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ موجودہ امریکہ ویورپ کے سیاسی نظریات پر تبصرہ فرمارہے ہیں۔

قوم پرست مغربی حکومتوں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''قوم پرست حکومتوں کا معیار عزت وعظمت یہ ہے کہ زمین کے بڑے سے بڑے رقبہ پر ان کا تسلط واقتدار ہو، ملک کے حدود وسیع اور ذرائع آمدنی وافر ہوں، اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلّط کرنے اور ہمسایہ قوموں یا حریف سلطنتوں کو خوف زدہ کرنے کا ان کے پاس پورا سامان ہو۔''(۱)

مغربی حکومتوں کے خالص مادی طرز فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''حکومتیں دراصل ایک ترقی یافتہ منظّم اور محفوظ تجارتی ادارے ہیں، یہ اصولی طور پر نفع پہنچانے کے لیے نہیں نفع اٹھانے کے لیے قائم ہوتی ہیں، وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اصلاحی مقصد نہیں رکھتیں، وہ بے تکلف اخلاق وشریعت کے اصول نظرانداز کر دیتی اور اخلاقی تعلیمات ومصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہیں، ہر مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر معاشی واقتصادی ہوتا ہے، ہر طرح کی بداخلاقی وبے حیائی اگر ان کی نظر میں نظم اور ضبط کے دائرہ میں ہو تو درست اور روا ہے۔''(۲)

اس طرز سیاست کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''اس طرز سیاست کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اہل ملک کے اخلاق روز بروز پست ہوتے چلے جائیں اور ایک خطرناک اخلاقی انحطاط اور اخلاقی امراض رونما ہوں اور پوری قوم میں اور اس کے ہر طبقہ میں تاجرانہ ذہنیت اور نفع اندوزی اور موقع پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جائے۔''(۱)

''جس طرح یہ مادہ پرستی حکومتوں کی روح میں داخل ہو چکی ہے اسی طرح عوام بھی اس کا شکار ہیں، ان میں ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے جس میں اخلاقی قدروں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر شخص اپنے سامنے ایک بلند معیار زندگی رکھتا ہے اور وہاں تک پہنچنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے، ہر بلند معیار کے بعد دوسرا اس سے بلند معیار سامنے ہوتا ہے اور ہر شخص اس ریس میں ہے کہ کس طرح اس کو حاصل کرلے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی میں تلخی اور کوفت بہت بڑھ گئی ہے اور ا ن دلوں سے رخصت ہو گیا ہے۔''(۲)

قوت واخلاق کا عدم توازن

اخلاق کے اس انحطاط کے بعد حضرت مولانا نے دکھایا ہے کہ یورپ کی سائنٹفک ترقیاں اورا فات عالم انسانیت کے لیے بجائے راحت رساں ہونے کے ہلاکت وبربادی کا ذریعہ ہیں، اس کی وجہ صرف طاقت اور اخلاق کا عدم توازن ہے۔فرماتے ہیں :

''بدقسمتی سے یورپ میں قوت واخلاق اور علم ودین کا توازن صدیوں سے بگڑا ہوا ہے، نشأۃ جدیدہ کے بعد سے مادی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کرتے رہے اور دین واخلاق میں تنزل وانحطاط واقع ہوتا گیا، کچھ مدت کے بعد ان دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا اور ایک ایسی نسل پیدا ہوگئی جس کے ترازو کا ایک پلڑا آسمان سے باتیں کرتا ہے اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے۔ پروفیسر جوڈ نے خوب کہا ہے کہ ''علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی لیکن ہم ان کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کررہے ہیں۔'' (۱)

اس کے بعد حضرت مولانا نے مغربی مصنّفین کے اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے اور اس جدید قوت کی ہلاکت آفرینی کے واقعات وشواہد قلمبند فرمائے ہیں۔

اپنی ایک تقریر میں حقائق کی روشنی میں بڑے جوش کے ساتھ مغرب میں بسنے والوں کو خطاب کرکے کہتے ہیں :

''ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت معاشرۂ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرسکتی ہے، وہ خلا میں سفر کرنے کے لیے محفوظ وسریع السیر آلات تیار کرسکتی ہے، وہ انسان کو چاند اور سیاروں پر پہنچا سکتی ہے، وہ ذراتی طاقت سے بڑے سے بڑا کام لے سکتی ہے، وہ ملک سے غریبی دور کرسکتی ہے، وہ علم وہنر کو آخری نقطۂ عروج پر پہنچا سکتی ہے، وہ پوری کی پوری قوم اور ایک ملک کی آبادی کو خواندہ وتعلیم یافتہ بنا سکتی ہے، اس کی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں لیکن وہ صالح اور صاحب یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی ناکامی اور بدقسمتی ہے اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع اور برباد ہورہی ہیں اور ساری دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے اور اب اس کا سائنس اور علم پر سے بھی ا داٹھ رہا ہے، اندیشہ ہے کہ دنیا میں ایک شدید ردعمل کی تحریک اور علم وتمدن کے خلاف بغاوت کے دور کا آغاز نہ ہوجائے۔'' (۱)

حضرت مولانا نے یہ بھی دکھایا ہے کہ یورپ آج قوت واخلاق کے عدم توازن کی وجہ سے بے بسی کی حد کو پہنچ رہا ہے اور اس کے مفکرین کو یہ اعتراف کرنا بڑ رہا ہے کہ ہمارے پاس وسائل ہیں لیکن مقاصد نہیں۔مولانا فرماتے ہیں :

''یورپ کی آج سب سے بڑی کمزوری وبے بسی یہ ہے کہ اس کے پاس وسائل اور ذرائع کا خزانہ موجود ہے لیکن نیک خواہشات اور نیک ارادوں کا فقدان ہے، وہ ایک طرف وسائل اور ذرائع میں قارون ہے، دوسری طرف نیک مقاصد میں محض مفلس اور قلاش! اس نے کائنات کے راز منکشف کیے اور طبعی طاقتوں کو اپنا غلام بنایا، اس نے سمندروں اور فضاؤں پر فرمانروائی حاصل کی لیکن وہ اپنی خواہشات اور نفس پر قابو نہ حاصل کرسکا، اس نے کائنات کے عقدے حل کیے لیکن اپنی زندگی کی پہیلی نہ بوجھ سکا، اس نے منتشر اجزاء اور طبعی طاقتوں میں نظم وترتیب قائم کی لیکن اپنی زندگی کا انتشار دور نہ کرسکا ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا'' (۱)

دجل وفریب

چونکہ اس تہذیب کی بنیاد ہی مادیت پر ہے اس لیے حصول لذت ونفع کے لیے اس کے سارے اصول ڈھول کا پول ہیں، بھاری بھرکم الفاظ اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتے، نفع کے حصول کے لیے اس کے نزدیک ہر طرح کا دجل وفریب، مکاری وملمع سازی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

حضرت مولانا نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''معرکۂ ایمان و مادیت'' کے آغاز ہی میں مغربی تہذیب کے اس دجل وفریب کا پردہ چاک کیا ہے۔ یہ پوری کتاب حضرت مولانا نے سورۂ کہف کے سایہ میں لکھی ہے اور اس میں اس سورۂ شریفہ سے متعلق بہت سے وہ حقائق بھی آ گئے ہیں جو عام طور پر تفسیروں میں بھی نہیں ملتے، احادیث میں اس سورۂ شریفہ کے بارہ میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن اس کی تلاوت کا معمول بنائے وہ دجال سے محفوظ رہے گا۔ حضرت مولانا نے اسی مناسبت سے اس کی تمہید میں دجال کی شخصیت کی بیان کی ہے اور دجل اور دجالیت کو اس کا محور قرار دیا ہے، مغربی تہذیب کو حضرت مولانا نے اسی کا ہراول دستہ قرار دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :

''عہد حاضر کی مادی تہذیب کا بھی سب سے بڑا حربہ یہی ملمع سازی اور فریب کاری ہے، اور اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے کسی چیز کو اس کے اثر سے آزاد نہیں چھوڑا، حقائق کچھ اور ہوتے ہیں نام ان کے برعکس رکھے جاتے ہیں، اصطلاحات اور شکوہ الفاظ کا بکثرت رواج ہے، ظاہر و باطن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، آغاز و انجام، تمہید و اختتام، نظریات اور عملی تجربوں میں نیک نیتی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ہے۔'' (۱) ''مثلاً حریت، اشتراکیت جمہوریت، معیار زندگی کی بلندی، معاشی خوشحالی، فلاحی ریاست، انسانی حقوق، یہاں تک کہ تمدن وتہذیب، فنون لطیفہ اور قانون ودستور جیسے الفاظ صرف نعروں کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں۔'' (۲)

اخلاق کی بھی اس نے دو قسمیں کر رکھی ہیں، دکھانے کے لیے اور ہیں اور برتنے کے لیے اور، حضرت مولانا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

''یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں، ان کی مثال وہی ہے کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں، لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں، انفرادی زندگی میں ان کا حال یہ ہے کہ اگر نو بج کر بارہ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہنچیں، لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکہ دینے میں انہیں ذرا تأمل نہیں۔'' (۱)

غلو اور انتہا پسندی

اسلام کے توازن واعتدال کے بالکل برخلاف اس تہذیب کی ایک بنیادی کمزوری اس کی انتہا پسندی اور غلو ہے۔

حضرت مولانا اس کمزوری کو بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اسراف، مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی اس تہذیب کی علامت اور شعار بن گئی ہے جس سے وہ اور اس کے پیروکار پہچانے جاتے ہیں۔ کمانے میں اسراف، لہو ولعب اور تفریح طبع میں اسراف، خرچ کرنے میں اسراف، سیاسی ومعاشی نظریات میں اسراف، جمہوریت ہو تو اس میں غلو، آمریت ہو تو اس میں مبالغہ، اشتراکیت ہو تو اس میں انتہا پسندی، اپنے خود ساختہ قوانین اور مقرر کردہ اصول اور قدریں ہوں تو اس کی ضرورت سے زائد تقدیس، یہاں تک کہ بال برابر اس سے ہٹنا روا نہیں ہوتا اور اس سے انحراف کرنے والا ایسا مجرم سمجھا جاتا ہے جس کے بعد وہ کسی عزت وشرافت کا مستحق اور کسی احترام کے قابل نہیں رہتا۔ یا پھر ایسی احمقانہ اور مجنونانہ بغاوت جو عقل، ذوق سلیم اور فطرت انسانی سب کے لیے ناقابل قبول ہے اور جس کے بعد آدمی متمدن انسانوں کی صف سے نکل کر درندوں اور مویشیوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔'' (۱)

خالق کائنات سے بغاوت

گذشتہ سطور میں یہ بات گذر چکی ہے کہ اس تہذیب کی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر پڑی ہے، عقیدۂ آخرت سے عملی انکار اس کے خمیر میں داخل ہے اور مادیت اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر چکی ہے اور ہر وہ چیز جو اس کی عقل میں نہ سما سکے اس سے انکار اس تہذیب کا امتیاز ہے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں :

''اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی مادی طاقت، طبعی قوتوں کی تسخیر، کائنات پر اقتدار، کفر اور مادہ پرستی کے ساتھ بالکل گھل مل گیا ہے اور یہ مغربی تہذیب کی مخصوص علامت اس کی امتیازی خصوصیت اور نمایاں پہچان بن گئی ہے، ہم کو کسی ایسی تہذیب اور تمدن کا علم نہیں جو اس درجہ مادی قوت رکھنے کے ساتھ مذاہب واخلاق سے اس درجہ برسر جنگ ہو، خالق کائنات اور اس کی بنائی ہوئی شریعت اور دستور وقانون کا اس طرح باغی ومنکر اور مادیت کی پرستش، نفس کی غلامی اور ربوبیت کے دعویٰ میں اس طرح مبتلا ہو جس طرح یہ مغربی تہذیب!''(۱)

یہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے تفصیل سے مغربی تہذیب کی خامیاں گنائی ہیں، اور اس پر بڑا مبصرانہ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ فرمایا ہے، اور پھر جس طرح اس تہذیب نے اسلامی تہذیب ونظام پر حملے کیے ہیں اور اس کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے ہیں ان کو تفصیل سے بیان فرماتے ہوئے اس کے خطرات سے بچنے کی تدابیر بھی بیان فرمائی ہیں۔

اسلام پر مغرب کی یلغار

شروع ہی سے مغرب نے اسلام کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھا، اس کو پورا اندازہ تھا کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو دنیا کی قیادت کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس ہر طرح کے مسائل کا حل موجود ہے، اگر اس کو ذرا بھی موقع دیا گیا تو طاقت واقتدار یورپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گا، اس لیے یورپ نے مسلمانوں کی طاقت کمزور کرنے اور اسلام سے ان کے رشتہ کو منقطع کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، استعمار کے ذریعہ، تغریب اور تبشیر کے ذریعہ مستشرقین کی جماعت تیار کرکے ہر طرح انھوں نے مسلمانوں کو مجروح کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔

حضرت مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جگہ جگہ ان منافذ کی نشاندہی کی ہے جہاں سے مسلمانوں کے عقیدہ یا عمل پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

جو ممالک مغربی استعمار کا شکار ہوئے وہاں اس کی پوری کوشش کی گئی کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنوں کو مغربی سانچہ میں ڈھال دیا جائے، وہاں چونکہ مکمل کنٹرول یورپ ہی کا تھا اس لیے یہ کام بڑی آسانی سے انجام پایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ ممالک آزاد ہوئے تو ان کی زمام اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو ذہنی طور پر مغرب کے غلام تھے، تونس اور الجزائز اس کی کھلی مثالیں ہیں۔

جو اسلامی ممالک استعمار کا شکار ہونے سے بچ گئے وہ مغربی تہذیب اور فکر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں رکھ سکے، یورپ کے مصنّفین ومفکرین نے ایسا وفکری مواد تیار کیا کہ اس کے مطالعہ کے بعد خود بخود دین سے ا ختم ہو جاتا ہے اور اس کے لیے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ حضرت مولانا نے اپنی تصنیفات میں اس موضوع کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ استشر اق کے موضوع پر مولانا نے مدلل اور بسیط مقالہ تحریر فرمایا تھا جو ''اسلامیات اور مغربی مستشرقین'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد تصنیفات اور مضامین میں استشر اق کے سلسلہ میں حضرت مولانا نے واقعیت سے بھرپور اور متوازن گفتگو فرمائی ہے جن میں ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

استشر اق

استشراق کی اپنی تاریخ ہے، یہ تحریک اسلام کے خلاف کلیسا کی سرپرستی میں شروع ہوئی تھی جس کا مقصد ہی تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کرنا تھا، اس کے لیے بڑی تعداد میں یورپ نے فضلاء تیار کیے جنھوں نے اسلامی علوم میں مہارت پیدا کی، ان موضوعات پر فاضلانہ کتابیں تصنیف کیں، لیکن ان میں اسلامی عقائد ونظریات کے خلاف ایسا مواد داخل کر دیا کہ عام ذہن کا آدمی اس کے مطالعہ کے بعد متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، وہ ان فضلاء کی خدمات کی داد دینے پر مجبور ہوگا اور کتاب میں بین السطور اسلام کے خلاف جو زہرافشانیاں کی گئی ہیں ان کے ادراک سے اس کا ذہن قاصر رہے گا۔ حضرت مولانا نے بڑی حقیقت پسندی اور توازن کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں المعہد العالی للدعوۃ والفکر لا سلامی (۱) کے ء کو خطاب کرتے ہوئے استشراق کی مختصر تاریخ بیان فرمائی اور اس کے وجود میں آنے کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا :

''مغربی طاقتوں نے اپنی ذہانت سے بالکل صحیح سمجھا کہ محض فوجی برتری واقتدار اور محض سیاسی تنظیم واستحکام اور نئے اور مؤثر اسلحہ وطریق جنگ کافی نہیں، کسی ملک کو مستقل طور پر غلام رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کا تعلیم یافتہ اور مثقف طبقہ (Intellectual Class) قوت حاکمہ سے ذہنی طور پر مرعوب ہو، اس کے لیے انہوں نے مستشرقین (Orientalist) کو تیار کیا، بہت کم لوگوں نے اس راز کو سمجھا ہے کہ مستشرقین محض اپنے ذوق کی بنا پر تحقیقی کام نہیں کرتے، استشراق کے پیچھے سیاسی واستعماری مقاصد کام کرتے ہیں۔'' (۲)

مستشرقین کے طریقۂ کار کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''مستشرقین کے علم وفضل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی وضاحت میں بھی کوئی باک نہیں کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب وتمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش وجستجو میں وقت صرف کریں اور سیاسی ومذہبی اعتراض کی خاطر رائی کا پربت بنائیں۔'' (۳)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

''افسوس کی بات ہے کہ ہم بہت سے مستشرقین کو یہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ساری کدوکاوش تاریخ اسلام، اسلامی معاشرہ، تہذیب وتمدن، اور ادب وثقافت میں جھول اور کمزوریوں کی تلاش ونشاندہی میں صرف کرتے ہیں پھر ہولناک اور ڈرامائی انداز میں ان کو پیش کرتے ہیں، ان کی ذہانت وطباعی کا پورا مظاہرہ چہرۂ اسلام کو بدنما دکھانے میں ہوتا ہے اور اسی طرح اسلامی ممالک کے زعماء وقائدین کے دماغ میں اسلام اور اسلامی قانون وتہذیب کے سرچشموں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اور اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کردیتے ہیں کہ ان کا سارا جوش وخروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے (Modornization) اور اسلامی خانوں میں اصلاح وترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہوکر رہ جاتا ہے۔'' (۱)

اس کے بعد مستشرقین کی نازک حکمت عملی کا تذکرہ فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''مستشرقین نے سیرت نبوی اور تاریخ عرب کے موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں عہد جاہلیت اور زمانہ ماقبل اسلام کی ایسی تصویرکشی کی ہے کہ گویا انقلاب کا سب سامان تیار تھا، پیغمبر اسلام ﷺ نے صرف وقت شناسی سے کام لیا اور سہرا ان کے سر بندھ گیا۔'' (۲)

اپنے خطاب میں ایک جگہ مستشرقین کی حکمت عملی کو اور واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''انہوں نے اپنی پوری ذہانت ایسی کتابوں کے لکھنے میں صرف کردی جن میں صاف صاف اسلام پر حملہ نہ کیا جائے، ان کی ذہانت کی اور سمجھنے کی بات تھی کہ اسلام پر حملہ اگر ہوگا تو ایک مقابل طاقت پیدا ہوجائے گی، اس میں ایسا ہو کہ لوگ پڑھ کر دلائل کی روشنی میں (جو چالاکی کے ساتھ کتاب میں شامل کیے گئے ہیں) کتاب الٰہی کے بارے میں، حدیث کے بارے میں، علم وفقہ کے بارے میں، علم کلام کے بارے میں پھر

آخری درجہ میں اپنی تہذیب ومعاشرت کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہوں، جو شخص یہ کتابیں پڑھے گا وہ سمجھ لے گا کہ ہم تو بہت نیچی سطح پر زندگی گزار رہے تھے، ہمارے ءنے، ہمارے مربیوں نے اور ہمارے مصنّفین نے ان کمزوریوں کا اظہار نہیں کیا۔''(۱)

اس کے خطرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اس میں بہت سے مستشرقین اپنی کتابوں اور مضامین میں زہر کی خاص مقدار بہت احتیاط سے ملاتے ہیں، جو تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور قارئین کے لیے وحشت کا باعث نہ بنے اور ان کو بیدار اور محتاط نہ بنادے نیز ''محقق علاّم'' کی انصاف پسندی اور خلوص نیت مشتبہ نہ کردے، اس طرح کے مستشرقین کی تصنیفات ان مخالف مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ ضرررساں اور خطرناک ہوتی ہیں جو کھل کر دشمنی کا اظہار کرتے ہیں اور جن کی کتابوں میں دجل وفریب وافترا پردازیاں عریاں طریقے پر نظر آتی ہیں، کیونکہ مذکورۃ الصدر کتابوں کا مطالعہ کرنے والا متوسط درجہ کا کتاب خواں ان کو پڑھنے کے بعد متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''(۲)

اس کے بعد حضرت مولانا نے عالم اسلام کی یونیورسٹیوں اور دانش گاہوں کی کمزوری اور پست ہمتی کا ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے خالص اسلامی موضوعات میں بھی مغربی مصنّفین پرا دکرلیا اور ان کی کتابوں کو مآخذ ومرجع قرار دیا اور وہاں تصنیف وتالیف اور ریسرچ کا کام کرنے والے مستشرقین ہی کی کتابوں پر بھروسہ کرنے لگے۔

تعلیم یافتہ طبقہ کے اس مرض کی نشاندہی کے بعد حضرت مولانا نے عالم اسلام کو بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں خود ہونے اور مستشرقین کی تحقیقات کا محاسبہ وجائزہ لینے کی دعوت دی ہے۔

وہ تحریر فرماتے ہیں :

''مستشرقین کے منفی اثرات کے ازالہ اور اس نقص کی اصلاح کے لیے ئے اسلام، محققین ومفکرین اور مسلمان ریسرچ اسکالرز کی ذمہ داری ہے کہ وہ موضوعات پر محققانہ اور ''اوریجنل'' بحثیں تیار کریں، اور عالم اسلام کو صحیح اور قابل ا د (معلومات اور اسلام کے صحیح تصورات اور حقائق سے (ان خوبیوں اور امتیازات کا لحاظ کرتے ہوئے جو مستشرقین کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں) روشناس کریں بلکہ اسلوب واصول بحث، مجتہدانہ تحقیق ودقت نظر، وسعت مطالعہ، مآخذ ومراجع کی صحت واستناد اور پرزور استدلال واستنتاج میں ان پر بھی فوقیت لے جائیں، اور ان غلطیوں اور کمزوریوں سے بھی محفوظ ہوں جن کے عام طور پر مستشرقین شکار ہوتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان ءومحققین مستشرقین کی تصنیفات و تحقیقات کا جائزہ لیں اور حقائق وواقعات کی روشنی میں ان کا محاسبہ کریں، ان کی دسیسہ کاریوں اور عربی عبارتوں کے مفہوم سمجھنے یا ان کی تحلیل وتشریح میں ان کی غلطیوں کی نشاندہی کریں جس سے قارئین کو یہ معلوم ہو کہ جن مراجع ومآخذ پر وہ ا دکرتے ہیں، وہ ناقابل ا د ہیں۔ انہوں نے ان سے جو اہم نتائج نکالے ہیں اور ان پر اپنے دعوے کی پوری عمارتیں قائم کرلی ہیں۔ ان کی بنیاد ہی کمزور، مشکوک یا سرے سے معدوم ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائیں کہ ان کی ان معصومانہ کاوشوں میں سیاسی ومذہبی اغراض ومقاصد کہاں تک کام کررہے ہیں۔

لیکن صرف یہ ناقدانہ اور سلبی کام کافی نہیں ہے، مثبت اور تعمیری کام بھی ناگزیر ہے، اس کی فوری ضرورت ہے کہ اسلامی موضوعات پر وفکر انگیز معلومات اور محققانہ کام کا سلسلہ جاری رہے جو تحلیل وتجزیہ، مآخذ ومراجع کے دیانت دارانہ حوالہ اور مفید ومتنوع تفصیلی انڈکس سے (جو مستشرقین کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) معمور ہو، اس سلسلہ میں ایسے مواد اور کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے جن کی طرف بادی النظر میں ذہن نہیں جاتا اور جن کا موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا اور نہ روایتی طور پر وہ تاریخی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔''(۱)

ان دونوں کاموں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''جب تک یہ دونوں کام نہ انجام دیئے جائیں گے اس وقت تک عالم اسلام کا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ذہین اور حوصلہ مند نوجوانوں پر مشتمل ہے اور جو یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہا ہے، یا خود اپنے ملک میں اسلام کا مطالعہ یورپین زبانوں میں کرنے کا عادی ہے، مستشرقین کے مسموم افکار اور ان کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہوسکتا۔''(۱)

مغربی تہذیب کے خلاف مختلف ملکوں میں حضرت مولانا کی کوششیں

مغربی تہذیب کے بنیادی، اصولی اور عمومی جائزہ اور محاسبہ کے علاوہ حضرت مولانا نے دنیا کے مختلف ملکوں میں اس تہذیب کے فروغ وارتقاء اور وہاں پڑنے والے اس کے نقصانات کا بھی جائزہ لیا ہے۔(۲) اور اس کی روشنی میں وہاں بسنے والے مسلمانوں کو خاص طور پر ضروری ہدایات اور مشورے دیے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا نے ہر طبقہ کے لوگوں کو خطاب کیا ہے، حکام وسلاطین کو بھی مشورے دیے ہیں، تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی جھنجھوڑا ہے اور عام لوگوں کی بھی رہنمائی فرمائی ہے۔

اہل سلطنت وحکومت کی حضرت مولانا نے جس اسلوب میں رہنمائی فرمائی ہے وہ حضرت مولانا کی دعوت وفکر کا ایک مستقل باب ہے، اسی لیے اس کو علاحدہ تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

یہاں صرف تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کی مولانا نے جس انداز سے رہنمائی فرمائی اور ان کے سامنے مغربی تہذیب کے نقصانات واضح فرمائے۔ ان کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے :

سعودی عرب

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالمِ عربی

عالم عربی کی اصل پہچان حضرت محمد عربی روحی فداہٗ سے ہے، حضورﷺ سے وابستگی ہی اس کا اصل امتیاز ہے، وہیں سے دنیا کو روشنی ملی، دین و ایمان ملا، انسانیت کو رہنمائی ملی، تہذیب کی شمعیں روشن ہوئیں، انسان کو انسانیت کا مزہ آیا۔ اگر اس کا یہی امتیاز باقی نہ رہے تو دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح وہ بھی ایک ملک ہے جہاں عربی بولی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے سوا اس کی کوئی خصوصیت نہیں۔

یورپ نے یہ حقیقت سمجھ لی اور یہ کوشش کی کہ مرکز اسلام اور مہبط وحی کو اپنی اصل سے کاٹ دیا جائے اور اس کے لیے اس نے مصر کا انتخاب کیا جو دنیائے اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی ''الازھر'' کی وجہ سے عالم عربی پر چھایا ہوا تھا، عرب ملکوں میں جو لٹریچر مصر سے آتا اس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ مصر کو ''کنانۃ الاسلام'' کہا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلام اور عالم اسلام کی حفاظت کی، فوجی، اور اور تمدنی میدان میں مصر اسلام کا تھا اسی لیے یورپ کے ایک قائد نے مصر کو مشرق پر برتری حاصل کرنے کے لیے مدخل قرار دیا اور اس کی تسخیر کے لیے متعدد کوششیں کیں لیکن مصر نے ان کو ناکام بنا دیا صلاح الدین ایوبی نے مصر کے حاکم کی حیثیت سے بیت المقدس فتح کیا لوئس تاسع کو مصر میں شکست ہوئی، اور گرفتار ہوا، آخر میں نپولین بھی تین سال سے زائد قیام نہ کرسکا۔

مصر میں فرانسیسی استعمار کے دوران اس کی پوری کوشش کی گئی کہ نئی نسل کے ذہنوں کو مغربی بنا دیا جائے۔ محمد علی پاشا جو اگرچہ مختصر مدت رہا، نے فرانسیسی فوجوں کو ملک سے نکلنے پر مجبور کیا۔ مگر مغرب سے ثقافتی روابط قائم رکھے، مصری نوجوان مغربی ملکوں میں تعلیم کے لیے بھیجے جاتے، جو مغربی افکار و

نظریات کے ساتھ واپس آتے۔اسی جماعت میں رفاعہ بک طہطاری جنھوں نے مغربی طرز کے ادارے قائم کئے اور مغربی ادب کو عربی میں منتقل کیا، مغربی زبانوں کے لیے مدرسہ ''الالسن'' قائم کیا۔مصر کی حیثیت یورپ کے ایک شاگرد، مقلد یا خوشا چیں کی ہو کر رہ گئی تھی، اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ آہستہ آہستہ مصر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھلتا گیا اور تعلیم وثقافت میں برتری کی وجہ سے مصر دوسرے عرب ملکوں کے لیے نمونہ بن گیا۔حجاز مقدس بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔

حضرت مولانا نے اپنے پہلے ہی سفر حج میں یہ تبدیلی محسوس فرمالی تھی اور یہ اندازہ کرلیا تھا کہ اب سعودی عرب بھی مصر وشام کے راستے پر ہے۔حضرت مولانا کی نظر میں اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جس دعوت وتحریک کے نام پر مملکت کا وجود عمل میں آیا اس کو وہاں فراموش کردیا گیا۔مولانا نے امیر سعود کے نام ایک طویل اور مدلل مکتوب اسی سفر میں تحریر فرمایا تھا۔جس کی تفصیل انشاء اللہ دوسرے باب میں پیش کی جائے گی۔

مغربی تہذیب کے اثرات وہاں تیزی کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔حضرت مولانا نے دوسرے سفر میں اس کو جس طرح محسوس کیا برادر معظم ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں بھی ہے :

''۴۷ء میں ہم پہلی بار آئے تھے، اب ۵۰ء ہے، ان تین برسوں میں کھلا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک، مغربی تمدن، تجارت ومعاشیات اور افکار وخیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل اور دماغ مغربی بن چکے ہیں اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی نفسیات کا ذریعہ اظہار بنتی ہے، معاش کا انہاک، دولت آفرینی، عزت طلبی بحرانی حد تک پہنچ گئی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں کہ امریکہ کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے۔''(۱)

یہ تجزیہ، تجزیہ نگار کی بصیرت وطباعی، حقیقت رسی اور دردمندی ودلسوزی کا بڑا مظہر ہے۔حضرت مولانا نے صرف تجزیہ پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے دعوتی وفکری ذہن ومزاج کے ساتھ اس کے علاج کی تدبیر بھی فرمائی، وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں صحیح دینی فکر منتقل کرنے کی پوری کوشش کی، ملاقاتوں کے ذریعہ، تحریر وتقریر کے ذریعہ، اجتماعات کے ذریعہ۔اس سلسلہ میں سب سے زیادہ طاقتور تقریریں ''**بين العالم و جزيرة العرب**'' کے عنوان سے ریڈیو پر کی گئی، پہلی تقریر کا عنوان تھا ''**من العالم الىٰ جزيرة العرب**'' (دنیا کی گفتگو جزیرۃ العرب سے) اس میں حضرت مولانا نے دنیا کی زبانی جزیرۃ العرب کے سامنے حقائق بیان کیے ہیں، اور اس کی خوش فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

دنیا جزیرۃ العرب کو خطاب کرکے کہتی ہے :

''اے جزیرۃ العرب! جب تمہاری نظر ہماری طرف پڑتی ہے تو شرم سے جھک جاتی ہے اور جب تم خود اپنا مشاہدہ کرتے ہو تو حقارت آمیز نگاہ کے ساتھ، تمہاری نظر نئی نئی ایجادات وا　فات پر ہے، قوتوں کی تسخیر پر ہے، اور اس اخیر دور میں انسان نے جس طرح ایٹمی طاقت کو اپنے قبضہ میں کرلیا ہے اس سے تمہاری نگاہ خیرہ ہوئی جاتی ہے، قدرے ہمت کرکے شرمندگی اور اعتراف کے ساتھ تم یہ کہتے ہو کہ جب سے دنیا میری رہنمائی وسرپرستی سے الگ ہوئی علم وتمدن میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

ذرا ہوش کے ناخن لو اور غور کرو! یہ ہوا میں اڑنے والا اور سمندر کی موجوں سے کھیلنے والا انسان اپنے اخلاق اور معاشرتی حس میں، تعصب وتنگ نظری میں ایک چھوٹے سے بچہ کی طرح ہے جو ظاہری شکلوں اور صورتوں کو حقیقتوں پر ترجیح دیتا ہے، 　اور تفریح کا دلدادہ ہوتا ہے۔

اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ صورت کے پیچھے حقیقت کیا ہے تو ڈھول کا پول سامنے آجائے اور تمہیں یقین ہوجائے کہ آج بھی انسانیت وہیں ہے جہاں تم نے اس کو چھوڑا تھا، بلاشبہ پرندہ کی طرح اس کو فضا میں اڑنا بھی آگیا اور مچھلی کی طرح پانی میں تیرنا بھی، لیکن انسانوں کی طرح زمین پر چلنے کا اب بھی اس کو سلیقہ نہیں۔

اے جزیرۃ العرب! تمہیں ہماری آباد دانش گاہوں، کتابوں سے پٹے ہوئے کتب خانوں، اشاعتی اداروں، تصنیف وتالیف کے مراکز پر حیرت ہے اور اس باغ و بہار ادب کو داد وتحسین کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو جو ہر دن نئے نئے گل کھلاتا ہے!! فوراً فیصلہ مت کرو، ان تمام چیزوں کے پیچھے جو اصل قوت محرکہ ہے وہ صرف بینک بیلنس بڑھانا ہے، کتنے قلمکار ہیں جو لوگوں کے اخلاق وکردار کی تجارت کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ معاشرہ میں عریانیت اور فحاشی پھیل جائے، اس بات سے تمہیں ذرا تعجب نہ ہونا چاہئے کہ بڑے بڑے دانشور اور ادباء اخلاقی قوت برداشت اور عفت میں ان بدؤوں سے بھی گئے گزرے ہیں جن کو قساوت وجہالت کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔

اے جزیرۃ العرب! میں دیکھتی ہوں کہ ان بھاری بھرکم اصطلاحات پر تمہارے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، معاشرتی انصاف، مساوات، آزادی اور جمہوریت یہ وہ الفاظ ہیں کہ ان کو بولتے بولتے سیاسی لیڈروں کی زبانیں نہیں تھکتیں، صحافیوں کے قلم کی نوک پر یہ الفاظ رہتے ہیں لیکن کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ الفاظ اپنے اندر کچھ حقیقی مفہوم رکھتے ہیں اور دنیا پر اس کا کچھ اثر پڑتا ہے جیسے پہلے کوئی بات کہی جاتی تھی تو اپنے اندر حقیقت رکھتی تھی اور آدمی ناپ تول کر زبان کھولتا تھا؟؟ یہ سب خواب وخیال کی باتیں ہو کر رہ گئیں، زمانہ ''ترقی'' کر گیا، کتنی باتیں کہی جاتی ہیں جو بالکل بے حقیقت ہوتی ہیں، اب اگر کوئی ان ظاہری باتوں پرا دکرتا ہے اور ان کو سچ سمجھتا ہے تو اس کا خدا ہی خیر کرے۔

ظاہری راحت وآرام، مسرت وا ن کو دیکھ تمہیں رشک آ رہا ہے، میرے پھولے ہوئے جسم کو دیکھ کر تمہیں صحت کا گمان ہوتا ہے! درحقیقت یہ ورم ہے جو بیماری کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، ایک ناواقف انسان اس کو تندرستی سمجھتا ہے جب کہ میں سخت بیماری میں مبتلا ہوں، میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، میں طرح طرح کے امراض کا شکار ہوں، میں اپنا دکھ کس طرح بیان کروں، میرے اردگرد ایسے ڈاکٹر ہیں جو مرض کا مداوا مرض سے کر رہے ہیں، آپریشن کے نام پر انہوں نے میرے جسم پر گہرے گہرے گھاؤ کر دیے ہیں، خدا ہی ان کو ہلاک کرے، میری ہلاکت میں تو انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اقتصادی مشکلات کا علاج ان کو ضبط ولادت میں نظر آتا ہے، مال میں بے جا تصرفات پر روک لگانے کے لیے انہوں نے شخصی ملکیت ہی کو حرام قرار دے دیا، افراد کی ظلم وزیادتی کو ختم کرنے کے نام پر انہوں نے جماعتوں کی ساری زیادتیاں روا کر دیں، شخصی احتکار کی جگہ کمپنی کے احتکار کو دے دی گئی، ظالمانہ کمیونلزم کا علاج نزم سے کیا گیا جو سرے سے کمر ہی توڑ دیتا ہے، نزم کی خرابیاں دور کرنے کے لیے اندھی بہری جمہوریت کو فروغ دیا گیا، حاصل یہ ہے کہ جس مرض پر انہوں نے ہاتھ رکھا دوسرا مرض پیدا کر دیا، ظلم واسراف کا علاج بھی کیا تو ظلم واسراف ہی سے، ایک جہالت ختم کی اس کی جگہ دوسری جہالت پیدا کر دی، میرے اندر انہوں نے امراض ہی امراض بھر دیے اور مجھے زار و نزار کر دیا۔'' (۱)

پھر یہ دنیا بڑے درد اور بے چارگی کے ساتھ جزیرۃ العرب سے کہتی ہے :

''اے جزیرۃ العرب! میں اپنی ساری بیماریوں کے ساتھ تمہارے سامنے حاضر ہوں، میں نے ایک ایک چیز کھول کر بیان کر دی، تم نے پہلے بھی میری مدد کی تھی اور سرخ موت سے مجھے بچایا تھا، آج پھر میں مدد کی طلبگار ہوں، اور آج بھی مجھے اسی طرح مدد کی ضرورت ہے جس طرح اس دن تم نے میری نیّا پار لگائی تھی جب تمہارے رسول دنیا میں تشریف لائے تھے، اور روشنی کی کرن آپ ﷺ نے مجھ پر ڈالی تھی۔

اے جزیرۃ العرب! میں تم پر قربان، میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب مجھ سے لے لو، میری ساری کمائی تمہاری نذر، مجھے تو بس ایمان کی بھیک دے دو، یہ مجھے بازاروں میں نہیں ملتا، بڑے سے بڑے کارخانے انوکھے سے انوکھا مال تیار کرنے کے باوجود اس کو تیار نہیں کر سکتے، یہ مجھے اپنے وسیع کتب خانوں سے بھی نہیں مل سکتا، میرے بڑے بڑے فلاسفر، تھنکر، لیڈر اور رائٹر بھی اس کو فراہم کرنے سے عاجز ہیں، یہ ایمان تو ساری دنیا کو صرف اس نبی امی کے ذریعہ ملا جو تمہاری گود میں ہے، مرنے کے بعد اس کو دوبارہ زندگی ملی، وہ اندھی ہو چکی تھی، یہ صرف اس نبی امی کا فیض ہے کہ اس کی آنکھوں میں روشنی اور چمک پیدا ہوئی، اس کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی وہ اپنی جگہ پر آ گئی، دنیا میں اگر کسی کو ایمان کا شمہ بھی ملا تو اس نبی ﷺ کے صدقہ میں ملا اور قیامت تک اگر کسی کو ملے گا تو آپ ﷺ کے واسطہ سے ہی ملے گا، اسی کے لیے میں بھی

تمہارے سامنے کاسۂ گدائی لیے کھڑی ہوں، تم مجھے ناکام ونامراد نہ کرنا۔''(۱)

پھر وہ بڑی عاجزی کے ساتھ فریاد کرتی ہے۔

''فیضان محمدی ﷺ کے کچھ قطرے ہی مجھے دے دو، اس کے ذریعہ سے میں اپنی مشکلات حل کرلوں اور الجھی ہوئی اپنی گتھیاں سلجھالوں، میرے مردہ دل میں کچھ جان پڑ جائے اور اس کے ذریعہ سے ہی مادیت کی اس آگ کو بجھا سکوں جس نے پورے تمدن کو بلکہ پوری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

تم نے بے شک پٹرول دے کر مجھے مالا مال کیا ہے، اس سے میری مشینیں اور گاڑیاں چلتی ہیں، مجھے اس کا اعتراف ہے مگر مجھے تو کچھ اور ہی چیز مطلوب ہے جو اس سے بہت قیمتی ہے، مجھے تو یہ انتظار ہے کہ زندگی کی گاڑی دلدل میں پھنس گئی ہے تم اس کو نکال دو اور صحیح رخ پر ڈال دو تا کہ اس کے سوار نجات پا سکیں، بڑے بڑے حکماء اور اصحاب فن عاجز آچکے، اب تمہارے پاس جو نبوت کی حکمت اور ایمان ویقین اور رسالت کی باقی ماندہ قوت ہے اس کے ذریعہ سے جو ناؤ گرداب میں پھنس گئی ہے اس کو پار لگا دو اور اسلامی شریعت وہدایات کی روشنی میں اس کو صحیح راستہ پر ڈال دو۔

تمہیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہئے کہ تم میرا ہی ایک حصہ ہو، میرا ہر برا بھلا ضرور تم پر اثر ڈالے گا، میری گرم لپٹیں تمھیں جھلسائیں گی اور ٹھنڈی ہوائیں تمھیں آرام پہنچائیں گی، تم مجھ سے علاحدہ ہو کر نہیں رہ سکتے، اگر تم نے میری فکر کی اور مجھے سنوارا تو خود اپنے اوپر احسان کیا اور اگر پہلو تہی کی تو خود مصیبت مول لی۔''(۱)

عالم عربی پر مغربی تہذیب کے اثرات کا حضرت مولانا نے اپنی اس پہلی تقریر میں جس بلیغ انداز میں جائزہ پیش کیا ہے اس کو حضرت مولانا کی فکر کا متن کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسری تقریر ''**من جزیرۃ العرب الیٰ العالم**'' (دنیا کو جزیرۃ العرب کا جواب) کے عنوان سے فرمائی جس میں عالم عربی دنیا کو اس کی گفتگو کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے :

''آپ نے بے شک اپنے ایک جز کو مخاطب کیا جو آپ کے رنج والم میں پوری طرح شریک ہے، دنیا کی قیادت کا تذکرہ کر کے آپ نے وہ زمانہ یاد دلا دیا کہ جب بھی میں اس کو یاد کرتا ہوں تو غم واندوہ کے بادل مجھ پر چھا جاتے ہیں۔

پہلے میری حیثیت ہی کیا تھی! آپ کے بڑے متمدن لوگ مجھے لائق اعتناء بھی نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ خود ان کا حال یہ تھا کہ زندگی کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں رہی تھی، انبیاء کی تعلیمات فراموش کی جا چکی تھیں، میرا حال بھی غیر ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ کو انسانیت پر ترس آیا اور اس نے مجھ میں ایک رسول بھیجا جن کا وجود انسانیت کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دنیا کے لیے باعث زیب وزینت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بعثت سے سرفراز فرمایا اور انہوں نے قوم کی ایسی تربیت کی کہ وہ عجیب وغریب صفات کی حامل بن گئی۔ یہیں سے میرے اندر ایمان کا کرنٹ دوڑ گیا اور ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہوگئی۔ جب میں آگے بڑھا تو آپ نے مجھے بھی طالع آزما بادشاہوں اور ملک وبادشاہت کے طالب جنگ کرنے والوں میں سمجھا اور پوری طرح میرا مقابلہ کیا، جب کہ میرا مقصد صرف آپ کو بت پرستی کے روگ سے اور تمدن کی خرابیوں سے نکالنا تھا، آپ نے مقابلہ کی بڑی کوشش کی لیکن آہستہ آہستہ مادیت کی برف پگھلنی شروع ہوئی اور ایمان کی حرارت کے آگے وہ پوری تحلیل ہو کر رہ گئی۔ پھر جب آپ نے میرے پیغام پر غور کیا تو آپ کو اندازہ ہوا کہ دین ودنیا کی بھلائی اسی میں مضمر ہے، یہی سلامتی اور علم وعقل کا پیغام ہے، تمدن کی اساس ہے اور انسانیت کی معراج ہے۔ پھر پوری طرح آپ نے سپر ڈال دی اور یہ نظام قبول کر لیا۔

پھر فتوحات کا دروازہ کھل گیا، مال غنیمت کے انبار لگ گئے، دنیا کے خزانے میرے قدموں میں آنے لگے، مجھے کہاں ان چیزوں سے سابقہ پڑا تھا، یہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں ایمان کی آگ بجھنے لگی، روح ٹھنڈی پڑ گئی ۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مجھ پر ایسا زوال آیا کہ زندگی کے میدان میں میرا رہنا مشکل ہوگیا، میں نے اپنا بستر لپیٹا اور گوشۂ عافیت سنبھالا، لیکن یہ ایسا عالمی حادثہ تھا اور انسانیت کے لیے ایسا عمومی خسارہ تھا کہ قومیں شتر بے مہار بن گئیں۔

لوگ علوم وتمدن، سیاست میں ادھر ادھر بھٹکنے لگے، انہوں نے بڑے بڑے وسائل اور طاقتیں ایجاد کرلیں لیکن ایمان واخلاق کو مذاق سمجھا، آپ کی ترقی میں ایسی کجی پیدا ہوگئی جس نے نظام کو بگاڑ کر رکھ دیا، آپ کو جو بھی شکایتیں ہیں وہ اسی عدم توازن کا نتیجہ ہیں۔" (۱)

اخیر میں جزیرۃ العرب بڑے جوش کے ساتھ دنیا کو مخاطب کر کے کہتا ہے :

"آپ کے سر میں مادیت کا ایسا سودا سمایا کہ آپ نے میرے اندر صرف خزانے تلاش کیے، آپ کو صرف پٹرول کے ان چشموں کی فکر تھی جو میرے اندر جاری ہیں، ہم نے کبھی آپ کو محروم نہیں کیا، ہمیشہ آپ کی پیاس بجھائی، سائل کو اس کی طلب وہمت کے بقدر ہی ملتا ہے، آج آپ ایسی چیز کا سوال لے کر آئے ہیں جو سب سے زیادہ قیمتی اور بلند ہے اور انسانیت کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ آپ مجھ سے رہنمائی چاہتے ہیں، میں آپ کا تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں، آپ کے سامنے دین سماوی اور وحی الٰہی کا چشمۂ صافی رواں دواں ہے، جس کی پوری مدت میں نے حفاظت کی ہے، اس سے خوب خوب سیراب ہوئیے، ایمان ویقین کی اپنی پیاس بجھائیے، خوش بخت زندگی اور علم کے صحیح گر سیکھئے عمل صالح اور اخلاق حسنہ کی تعلیم لیجئے، ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں صحیح رہنمائی حاصل کیجئے، یہ رہنمائی صرف ایمان ہی سے ملے گی، چشمۂ صافی سے حقیقت ایمان کا جام پی کر طاقت ونشاط اور زندگی پیدا کیجئے، روشنی اور شباب کے نکھار کے ساتھ سامنے آجائیے اور ایسی تاریک اور بیمار دنیا کا بدل بن جائیے جو زندگی وروح سے خالی ہو چکی ہو اور اس پر بڑھاپا طاری ہے اور اس کے پاس انسانیت کے لیے کوئی پیغام نہیں۔" (۱)

یہ دونوں تقریریں حضرت مولانا کی فکر ونظر اور اسلوب بیان کا شاہکار کہی جاسکتی ہیں۔ ان میں حضرت مولانا نے مغربی تہذیب کی خرابیوں کو جس حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں عقل کو بھی غذا فراہم کی گئی ہے اور قلب کو بھی گرمایا گیا ہے۔ اسی طرح یہ عالم عربی میں حضرت مولانا کی اس دعوت وفکر کی تمہید بھی ہے جو پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ نصف صدی پر محیط ہے۔

مولانا کی ان تقریروں اور ملاقاتوں کا نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر اچھا اثر پڑا، اور ایک نئی فکر ان میں پیدا ہوئی۔

مصر وشام

حضرت مولانا کو اس کا پورا اندازہ ہوگیا تھا کہ اس وقت عالم عربی کی قیادت مصر کے پاس ہے اور وہاں سے جو چیز بھی آتی ہے وہ قیمتی سمجھی جاتی ہے، یورپ اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا اور اس نے مصر کو اپنی کوششوں کا مرکز بنا رکھا تھا اور اسی کے راستہ سے مغربی تہذیب وفکر عالم عربی میں منتقل ہو رہی تھی۔ مولانا نے ضروری سمجھا کہ مصر کا سفر کر کے وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

اپنے دوسرے سفر حجاز ہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہیں سے مولانا نے مصر کا رخ فرمایا، وہاں علم وادب اور دعوت وفکر کے چوٹی کے لوگوں سے ملاقاتیں فرمائیں۔ مولانا کی معرکۃ الآراء تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کچھ ہی ماہ پہلے وہاں چھپی تھی، اس کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس طرح وہ کتاب حضرت مولانا کے لیے ایک وزیٹنگ کارڈ کی طرح ثابت ہوئی۔ مولانا نے وہاں کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور دینی مدارس ومعاہد کا بھی مشاہدہ فرمایا، نظام تعلیم بھی دیکھا، اجتماعی تقریبات میں بھی شرکت فرمائی۔ مولانا نے محسوس فرمایا کہ ہر جگہ اپنی اپنی سطح کے اعتبار سے مغربی نظام وفکر کی حکمرانی ہے۔ مخلوط نظام تعلیم کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

"مخلوط تعلیم ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کا فیشن اور آزادی وتہذیب کی علامت بن چکی ہے، یہ ذہنیت اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ

اس موضوع پر تنقید کا ایک لفظ نہیں سننا چاہتے۔اس کے جو نتائج ہیں وہ اپنی جگہ پر، جو شخص ان پڑھے لکھے لوگوں سے اس کے بعد بھی خیر کی توقع کرے اس سے اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بعدمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش''(۱)

مغربی تہذیب کے اثرات اس قدر گہرے پڑ چکے تھے کہ اسلامی تمدن اس کے اوٹ میں چھپ گیا تھا اور نئی نسل ایسی تیار ہوگئی تھی جو نہ عمل کے اعتبار سے مسلمان تھی اور نہ اسلام پر اس کوا　د باقی رہ گیا تھا اور مغربی تہذیب سے بھی اس نے وہ اجزاء نہیں لیے تھے جو ترقی کی راہ میں سنگ میل ثابت ہو سکتے تھے۔لارڈ کرومر (Cromer) نے جو ایک ایسے جدید مصر کی تشکیل کا سب سے بڑا مغربی داعی تھا جو اسلام کے برائے نام رشتہ کے ساتھ مغربی افکار و اقتدار کا حلقہ بگوش وعلمبردار ہو، اس طبقہ کی ا　دی، ذہنی اور اخلاقی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کی چکی میں پس کر کس طرح ایک ایسی نئی مخلوق پیدا ہوئی ہے جو نہ پورے طور پر مسلمان ہے نہ مغربی۔وہ لکھتا ہے :

''مصری معاشرہ تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ایسے افراد کی جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو مسلمان ہیں تو اسلامی تہذیب سے عاری اور اگر یورپین ہیں تو کمر شکستہ (کمزور اور یورپی صفات سے بھی محروم یورپ کا اثر یافتہ مصری بسا اوقات برائے نام تو مسلمان رہتا ہے لیکن فی الحقیقت عموماً وہ منکر الٰہیات ہوتا ہے۔''(۱)

آگے وہ لکھتا ہے :

''مصری آزاد خیال اس سے (یعنی یورپین آزاد خیال) سے بھی آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک ایسے طوفانی سمندر میں پاتا ہے جہاں نہ　ہے اور نہ ناخدا، نہ تو اس کا ماضی اور نہ اس کا حال ہی اس پر کوئی پرزور اخلاقی رکاوٹیں حائل کرتا ہے۔''(۲)

حضرت مولانا نے ان حالات کا پورا مطالعہ کیا اور پھر اہل فکر　ء کو متوجہ کیا، اس کے لیے جا بجا تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔

مصر میں چھ ماہ کے طویل قیام کے دوران سعودی عرب میں ریڈیو پر کی گئی تقریریں بھی شائع ہوئیں، اور بھی متعدد دعوتی وفکری رسائل شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، وہاں کی دینی جماعتوں اور قائدین نے ان میں اپنی حکایت دل محسوس کی۔

''إسمعي يا مصر'' کے نام سے حضرت مولانا نے مصر کو جو پیغام دیا اس کو سن کر متعدد چوٹی کے اصحاب فکر ودعوت　ء نے کہا کہ ''کاش مصر سن لے!''۔

مصر کی تاریخی جغرافیائی اور دینی حیثیت کے اعتراف واظہار کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا :

''آپ دونوں ثقافتوں کا سنگم ہیں، آپ کے ایک جانب اسلامی ثقافت کا مرکز ہے تو دوسری جانب مغربی ثقافت کا، آپ پر دو براعظموں ایشیا اور یورپ کی ذمہ داری ہے اور آپ دونوں ثقافتوں کا پیغام رکھتے ہیں، آپ کا کام یہ ہونا چاہیے کہ یورپ کے علم وتجربات کو آپ ایشیا اور عرب ملکوں میں منتقل کریں اور دوسری بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے پیغام کو یورپ تک پہنچائیں۔''(۱)

وہاں کے اہم ترین لوگوں سے تبادلۂ خیال کے دوران حضرت مولانا نے متعدد حضرات کے سامنے مغربی فکر کے بارے میں اپنا متوازن نظریہ پیش فرمایا۔اہم مجالس میں خطاب کے موقع پر بھی حضرت مولانا نے بڑی صراحت کے ساتھ عالم عربی میں مصر کی اہمیت وکردار کا ذکر کر کے فرمایا:''اس وقت مصر کی بڑی ذمہ داری ہے، اگر وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لے تو بہتر تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے۔''جمعية الشبان المسلمين کی ایک تقریر میں یورپ کے بارے میں فرمایا :

''وہ اس پکے ہوئے پھل کی طرح ہے جو اب اور تب گرنا چاہتا ہے اور دنیائے انسانیت دوراہے پر کھڑی ہے۔ ؎

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح

دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

یہ اسلامی قیادت کا دور ہے، اب اگر مسلمان آگے بڑھتے ہیں اور گم کردہ راہ دنیا کی قیادت سنبھالتے ہیں تو ٹھیک ورنہ دنیا دوسرا رخ اختیار کرے گی۔''(۲)

مصر سے حضرت مولانا فلسطین، شام اور سوڈان بھی تشریف لے گئے۔ وہاں بھی مولانا نے مادیت کے اثرات پائے جو مغرب کی دین ہے۔

دوران سفر بحری جہاز میں فجر کی اذان ہوئی۔ مسافروں کی تعداد کم ہونے کے باوجود بھی وہ سب کو بیدار نہ کر سکی، مولانا نے ان الفاظ میں اس پر اپنے تاثر کو قلمبند فرمایا ہے :

''یہ وہی آواز تھی جس نے کبھی سارے عالم کو بیدار کر دیا تھا، بحر و بر میں زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ لیکن اس وقت یہ آواز جہاز کے سب مسافروں کو بھی نہ جگا سکی جو بہت تھوڑے تھے۔ کتنی دلخراش حقیقت ہے کہ اذان اپنی قوت و طاقت اور دلوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اس حد تک کھو چکی ہے کہ اس کی روحانی قوت و تاثیر کو سب سے زیادہ جس چیز نے کمزور و بے اثر کیا ہے وہ مغرب کی مادیت ہے، جس کو دین و عقیدہ اور عبادت و نماز کے سوا تمام چیزوں میں کامیابی کی منزلیں نظر آتی ہیں۔''(۱)

سفر سے حجاز مقدس واپسی پر حضرت مولانا نے علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار پڑھ کر اپنے تاثرات ظاہر فرمائے :

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے — دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ و سیماب

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

پھر جزیرۃ العرب کو مخاطب کر کے فرمایا :

''اے جزیرۃ العرب! تجھ سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس اذان کا سرچشمہ جس سے پہاڑ لرزتے اور تھراتے تھے اور وہ سجدہ جس سے زمین پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، ایمان سے بھرپور شوق و محبت سے لبریز، موت پر جری، شہادت کا شائق، دنیا سے بے نیاز اور مادہ سے مستغنی دل تھا۔ ایک زمانہ سے یہ دل کمزور ہو چکا ہے، مغربی مادیت و مادہ پرستانہ تعلیم نے اس کو سخت نقصان پہنچایا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی تپش اور حرارت، بے باکی و جرأت اور سوز دروں بہت کھو چکا، اس تبدیلی سے زندگی کا ہر شعبہ اور ڈھانچہ متاثر ہوا، وہ مسجد و مدرسہ، گھر اور بازار ہر کہیں عام ہو گیا اور اسے ہر شخص نے جو احساس سے عاری نہیں ہوا ہے محسوس کیا، حتیٰ کہ کل دمشق میں امیر الشعراء شوقی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ۔

اذا تعالیٰ ولا الآذان آذان — فلا الأذان أذان فی منارته

(مناروں سے بلند ہونے والی یہ اذانیں وہ نہیں ہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں، نہ یہ سننے والے کان وہ کان ہیں جو پہلے اذان سن کر مست ہو جاتے تھے۔)''(۲)

ERROR: syntaxerror
OFFENDING COMMAND: %ztokenexec_continue

STACK:

-filestream-
-mark-
/sfnts